# حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل


مقالہ نگار

رضینہ خان

نگراں

پروفیسر مظہر مہدی حسین


ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷


۲۰۱۴ء

# حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل

مقالہ نگار

**رضینہ خان**

نگراں

**پروفیسر مظہر مہدی حسین**

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

۲۰۱۴ء

**JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY**

**Center For Indian Languages**

**School of Language,Literature & Cultural Studies**

New Delhi 110067

Dated:

## Declaration

I declared that the work done in this Dissertation entitled " Haider Qureshi Ki Afsana Nigari ka Mutala" ( "A study of Haider Qureshi's short story writing") submitted by me is an original work and has not been previously submitted for a any other degree of this or any other unversity/ institution.

**Razeena Khan**

(Research Scholar)

**Prof. Ram Bux Jat**

Chairperson

CIL/SLL&CS/ JNU

**Prof.Mazhar Mehdi Hussain**

Supervisor

CIL/SLL&CS/ JNU

# فہرست ابواب

# حرفِ چند

حیدر قریشی اردو ادب کی ایسی قد آور شخصیت ہیں جن کے ادبی کارنامے ان کے گہرے مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔حیدر قریشی نے اردو ادب کی بہت سی اصناف میں فن کے جوہر دکھائے ۔اور ان اصناف کو ایک نئی معنویت اور گہرائی سے روشناس کرایا۔حیدر قریشی بیک وقت شاعر، ادیب، ناقد، صحافی، ماہیا نگار، سفر نامہ نگار، سوانح نگار، محقق، انشا پرداز، خاکہ نگار، اور یادنگار ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں دنیا کے اہم مسائل کو پُر اثر انداز میں پیش کیا۔انہوں نے اردو ادب میں نئی صنف ''ماہیا'' کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اردو ادب کو ایک نیا دلکش لب ولہجہ بھی عطا کیا۔حیدر قریشی نے جس وقت افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس وقت جدیدیت اپنے تمام تر جوبن پر نظر آتی ہے ۔اس رجحان سے متاثر ہو کر سریندر پرکاش،انور سجاد، بلراج مین را، نیر مسعود اور احمد ہمیش وغیرہ علامتی اور تجریدی افسانے لکھ رہے تھے۔۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ میں پھر سے تبدیلی آئی اور بیانیہ کے اسلوب اور کہانی پن کو افسانے کے لیے ضروری سمجھا جانے لگا۔حیدر قریشی نے بھی اسی دور میں افسانے لکھے۔ وہ وسیع القلب، وسیع الذہن اور وسیع النظر تخلیق کار ہیں۔وہ کسی بھی تحریک کی پیروی کرنے سے زیادہ روحانی تجربہ کو اہمیت دیتے ہیں ۔انہوں نے اپنے مشاہدے کو ہئیت کے اعلیٰ پیمانوں میں ڈھالا۔انہوں نے زندگی کی عکاسی میں بھی اسی نظریہ کو رہنما بنایا۔ان کے افسانوں میں مشاہدے کی کثرت، گہرائی کی شدت اور فہم کا تنوع ملتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں فکری اور فنی بصیرت سے کام لے کر جدید عہد کی زندگی اور پیچیدہ مسائل کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے ۲۴ گھنٹوں کو ۴۸ گھنٹوں میں بدل کر بہت کم وقت میں اتنا کچھ لکھا ہے ۔ان کے افسانے اپنی فکری اور فنی خوبیوں کے باعث معاصر اردو افسانہ میں خاص توجہ کے مستحق اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔مختلف دانش گاہوں میں حیدر قریشی کے بارے میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات لکھے گئے اُن مقالات میں حیدر

قریشی کے فن اور شخصیت کو بطور خاص پیش کیا گیا ہے۔حیدر قریشی اتنے اہم افسانہ نگار ہیں لیکن ابھی تک کسی یونیورسٹی میں ''حیدر قریشی کی افسانہ نگاری'' پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا اور نہ ہی اس عنوان سے کوئی کتاب لکھی گئی۔سوائے ان مضامین کے جو وقتاً فوقتاً ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔اس کے پیش نظر ہم نے اپنے ایم۔فل کے مقالہ کے موضوع کے لیے (حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ) منتخب کیا ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ہم اپنے اس مقالے میں حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں۔ان کے افسانوں کی تفہیم اور فن سے متعلق میری یہ چھوٹی سی کوشش ہے۔مقالہ کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب ''حیدر قریشی: سوانح اور ادبی ماحول'' ہے۔سوانح کے ذیل میں حیدر قریشی کی پیدائش، تعلیم، ملازمت ،شادی، اولاد، تصانیف، پاکستان میں شائع ہونے والی تصانیف، جرمنی میں شائع ہونے والی تصانیف، کن کن ملکوں اور رسالوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں، کہاں کہاں ان کا قیام رہا، حیدر قریشی کی زندگی کا ایک سال (۱۳/ جنوری ۲۰۰۳ سے ۱۳/ جنوری ۲۰۰۴ تک)، حیدر قریشی کا حلقہء احباب، شخصیت، پسند، حیدر قریشی اور جرمنی، وطن سے دور رہ کر ان کی تحریروں میں آنے والی تبدیلی، وہ کام جو مستقبل میں کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ان تمام پہلوؤں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب کے دوسرے حصہ میں ان فکری اور ادبی ماحول پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے جن سے حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کی تفہیم ہو سکے۔

دوسرا باب ''حیدر قریشی کا ادبی سفر مختلف اصناف کے حوالے سے'' ہے۔اس باب میں ان تمام اصناف (غزل، نظم، ماہیا، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، یادیں، تنقید، کالم) کا تعارف پیش کیا گیا ہے جن پر حیدر قریشی نے قلم اُٹھایا۔جو ان کے ذہنی فکر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تیسرا باب ''حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی دائرہ'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔موضوعات و میلانات کی تعریف اور موضوعات کے حوالے سے اردو افسانہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے حیدر قریشی کے افسانوں کا موضوعاتی جائزہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا باب ''حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا فنی تجزیہ'' ہے۔۱۹۶۰ کے بعد افسانہ کے فن کو پس منظر بنا کر حیدر قریشی کے افسانوں کے فن پر بحث کی گئی ہے۔

انسانی شخصیت کی تعمیر میں ہمیشہ ہی سے والدین اور اساتذہ کرام کا اہم کردار رہا ہے۔میری شخصیت کی تعمیر میں بھی میرے والدین اور استاد ونگراں پروفیسر مظہر مہدی کا بڑا حصہ ہے۔میری فطری سنجیدگی کے پیش نظر اس مقالے کا عنوان انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔میں خاص طور پر شکر گزار ہوں اپنے نگراں پروفیسر مظہر مہدی کی جن کی توجہ کے بغیر مقالہ مکمل کرنا مشکل تھا۔انہوں نے اپنی شفقت سے میری بہت سی مشکلات کو آسان کیا۔میرے لیے سب سے اہم مرحلہ حیدر قریشی کی کتب کے تمام ایڈیشن حاصل کرنا تھا جس کے لیے جناب حیدر قریشی صاحب نے میری بہت حد تک مدد کی یوں تو ان کی تمام تحریریں ان کی ذات کا آئینہ ہیں لیکن وقت پڑنے پر انہوں نے میرے سوالوں کا نہایت سلیقے کے ساتھ جواب دیا جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔علاوہ ازیں اپنی دوست شگفتہ یاسمین کی بھی شکر گزار ہوں۔

صد شکر اس رحیم وکریم کا جس نے والدین کی صورت میں ہمیشہ روشنی کی بشارت عطا کی۔

۱۴، جولائی ۲۰۱۴ء

رضینہ خان

جے۔این۔یو، نئی دہلی۔

# باب ۔ ۱

# حیدر قریش : سوانح اور ادبی ماحول

عام طور پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ اعلیٰ ادب پارے لازماً کسی اعلیٰ صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ صداقت ہم عصر سماج کی بھی ہو سکتی ہے اور انسانی فطرت یا کسی کائناتی حقیقت کی بصیرت پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔ایک ادبی متن انسان کی انفرادی بصیرتوں یا خود مصنف کی شخصیت اور زندگی کا اظہار بھی کر سکتا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ متعین اور واضح ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے)۔مصنف کے ایک مخصوص سماجی رکن کے طور پر کیا تصورات ،نظریات اور اعتقادات تھے؟ یا اس سماجی پس منظر میں اس کے نجی خیالات اور نفسیاتی کیفیات کیا تھیں؟ تنقید و تحقیق اسی قسم کے سوالوں کا جواب تلاش کرتی ہے۔اس لئے مصنفین کے بارے میں کتابیں عموماً ان کے خاندانی حالات ماحول یا سماج کے ان پر اثرات پر بحث کرتے ہوئے ان کی سوانح حیات سے شروع ہوتی ہیں۔

کسی ادبی متن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مصنف اور قاری اپنی الگ الگ ذاتی تاریخ رکھتا ہے۔ پھر جس لسانی معاشرے کا وہ حصہ ہوتا ہے اس کی بھی اپنی الگ تاریخ ہوتی ہے، تاریخ کے یہی انداز ایک فرد کے روپ کو تشکیل دیتے ہیں۔اس لئے اس کی انفرادی اور اجتماعی تاریخ کو پیش نظر رکھے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ:

۱۔ کوئی متن خلا میں تخلیق نہیں ہوتا اور نہ ہی خلا میں رہ سکتا ہے۔

۲۔ مصنف اور قاری اسی مادی دنیا اور انسانی سماج کے باشندے ہوتے ہیں اس لئے وہ متنوع سماجی اقدار (مذہبی، رومانی، اخلاقی ،معاشی ،علمی و تعلیمی وغیرہ) سے اثر پزیر ہوتے ہیں۔

۳۔ مصنف اپنی سماجی اقدار یا ان میں سے بعض کا اقرار یا انکار کرتے ہوئے اپنے تخلیق کردہ متن میں ان کا اظہار کرتا ہے۔

۴۔ ایک قاری خود اپنی ہی سماجی اقدار اور ذاتی تجربے کی روشنی میں متن سے معنیٰ اخذ کرتا ہے۔

۵۔ ٹھوس، مادی اور تاریخی حقائق انسان کے سماج اور شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور ان حقائق کو پیش نظر رکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر حیدر قریشی کی افسانہ نگاری اور ان کی شخصیت کی تفہیم کے امکانات میں اضافہ ممکن ہے۔

## نام:

نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدر قریشی

پیدائش: ۱۳ جنوری ۱۹۵۲ء (سرکاری دستاویز میں تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۵۳ء)

جائے پیدائش: ربوہ، ضلع جھنگ

## تعلیم:

ابتدائی تعلیم: پرائمری۔دو دو سال۔رحیم یار خان اور ربوہ میں (ذہانت کی بنا پر دوسری جماعت میں داخلہ ہوا)

مڈل (کالونی مڈل سکول خان پور)

۱۹۶۸: میٹرک (گورنمنٹ ہائی سکول خان پور)

۱۹۷۰: ایف۔اے

۱۹۷۲: بی۔اے

۱۹۷۴: ایم۔اے

## ملازمت:

۱۔ ۱۹۶۸ء میں جیٔ سنز شوگر ملز جیٹھ بھٹہ خان پور میں بطور لیبارٹری سیمپلر، تنخواہ ۸۷ روپے ماہانہ۔

۲۔ ڈھائی مہینہ بعد لیبارٹری بوائے ہوئے، تنخواہ ۱۰۴ روپے ماہانہ۔

۳۔ ۱۹۷۱ء میں لیبارٹری انالسٹ ہوئے، تنخواہ ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپے ماہانہ۔

۴۔ ۱۹۷۹ء میں شفٹ کیمسٹ کے عہدہ پر ترقی پا گئے۔

۵۔ ۱۹۹۰ء میں پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج، ایبٹ آباد میں اردو کے ٹیچر ہوئے۔ایسی ملازمت ہمیشہ سے ان کا خواب رہی ہے۔اپنے ایک انٹرویو میں حیدر قریشی نے ایبٹ آباد کے حوالے سے کہا: ''بے حد خوبصورت اور بے حد خوشگوار۔ایک تو مجھے ایک لمبے عرصہ کی بے روزگاری کے بعد ملازمت ملی تھی پھر ملازمت درس و

تدریس کی تھی۔جس ادارہ میں جاب ملی وہ ایک مستحکم ادارہ تھا۔پاکستان میں اس ملازمت کے بعد مجھے پہلی دفعہ آرام دہ زندگی کا احساس ہوا تھا۔(۱)

۶۔ حیدرقریشی نے ۳ ماہ کے لیے گوجرانوالہ میں بھی ملازمت کی۔یہ تقریباً ۱۹۸۶ء۔۱۹۸۷ء کی بات ہے۔

**شادی:** ۱۸سال(۱۹۷۱) کی عمر میں حیدرقریشی کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی 'مبارکہ' سے ہوئی۔حیدرقریشی نے نوکری اور شادی شدہ زندگی کی ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

**اولاد:** رضوانہ کوثر، درثمین (مانو)،شعیب حیدر،عثمان حیدر، طارق محمود حیدر (ٹیپو)

## تصانیفِ حیدرقریشی:

## (تصانیف نثری)

**روشنی کی بشارت** (افسانے) ۱۹۹۲ء

**قصے کہانیاں** (افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا بلکہ کتاب **افسانے** میں دونوں افسانوی مجموعے ایک جلد میں شائع کیے گئے ۔۱۹۹۹ء

**ایٹمی جنگ** (افسانے اردو اور ہندی میں ایک ساتھ) ۱۹۹۹ء

**میں انتظار کرتا ہوں** (ہندی میں افسانے) ۱۹۹۶ء

**میری محبتیں** (خاکے) ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۸ء

**کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں) یہ کتاب پہلے الگ سے نہیں چھپی بلکہ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں شامل رہی ۲۰۰۵ء۔لیکن ۲۰۱۳ء میں اسلام آباد سے الگ کتابی صورت میں چھپ چکی ہے۔

**سوئے حجاز** (سفرنامہ،عمرہ اور حج کا احوال) ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۴ء

**فاصلے قربتیں** (انشائیے) یہ کتاب الگ سے نہیں چھپی بلکہ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں شامل ہے ۲۰۰۵ء

.........................................

۱۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص، ۲۹۔

**عمرِ لاحاصل کا حاصل** (۵شعری اور ۶ نثری مجموعے ایک جلد میں) ۲۰۰۵ء

## (تصانیف شعری)

**سلگتے خواب** (غزلیں) ۱۹۹۱ء
**عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں، ماہیے) ۱۹۹۶ء
**محبت کے پھول** (ماہیے) ۱۹۹۶ء
**دعائے دل** ( غزلیں اور نظمیں) ۱۹۹۷ء
**غزلیں ، نظمیں، ماھیے** (چاروں شعری مجموعے ایک جلد میں) ۱۹۹۸ء
**درد سمندر** ( غزلیں، نظمیں، اور ماہیے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا بلکہ کلیات **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں شامل ہے۔ ۲۰۰۵ء

## (تحقیق وتنقید)

**اردو میں ماھیا نگاری** ۱۹۹۷ء
**اردو ماھیے کی تحریک** (مضامین) ۱۹۹۹ء
**اردو ماھیے کے بانی ھمت رائے شرما** (مضامین) ۱۹۹۹ء
**وزیر آغا۔عھد ساز شخصیت** (مضامین) ۱۹۹۵ء
**اردو ماھیا تحقیق و تنقید** (ماہیے کی تمام کتابوں کی ایک جلد) ۲۰۱۰ء
**حاصلِ مطالعہ** (تنقیدی مضامین) ۲۰۰۸ء
**تاثرات** (تنقیدی مضامین) ۲۰۱۲ء
**ماھیے کے مباحث** (مضامین) یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں شامل ہے۔
**اردو ماھیا** (ماہیے کی تمام کتابوں کا پیش لفظ) یہ کتاب اردو ماہیا تحقیق وتنقید میں شامل ہے۔
**ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت** ۲۰۰۹ء
**ھمارا ادبی منظر نامہ** (۴ کتابوں کی ایک جلد) زیر اشاعت

**(حالاتِ حاضرہ)** (کالموں کا مجموعہ)

**منظر اور پس منظر**،۲۰۰۹ء

**خبر نامہ**،۲۰۰۹ء

**ادھر ادھر سے** ،۲۰۰۸ء

**چھوٹی سی دنیا**،۲۰۱۲ء

**(ترتیب وتدوین)**

**شفق رنگ**(ضلع رحیم یار خان کے شعراء)۱۹۷۹ء

**کرنیں** (بھاول پور ڈویژن کے شعراء)۱۹۸۰ء

**سرائیکی غزل** ۱۹۸۰ء

**پہلا ورق** ،۱۹۹۰ء

**جرمنی آنے سے پہلے پاکستان میں شائع ہونے والی تصانیف:**

**کرنیں** (بھاول پور ڈویژن کے شعراء)

**سرائیکی غزل**

**شفق رنگ**(ضلع رحیم یار خان کے شعراء)

**پہلا ورق**(اوراق کے اداریوں کا مجموعہ)

**سلگتے خواب**(غزلیں)

**روشنی کی بشارت** (افسانے)

**عمر گریزاں** (غزلیں،نظمیں اور ماہیے)

**میری محبتیں**(خاکے)

**جرمنی آنے کے بعد شائع ہونے والی تصانیف:**

**دعائے دل** (غزلیں، نظمیں)

**محبت کے پھول** (ماہیے)

**سوئے حجاز** (سفرنامہ)

**کھٹی میٹھی یادیں** (یادنگاری)

اس سلسلے میں حیدر قریشی کا کہنا ہے کہ:''عمرِ گریزاں'' کی ساری شاعری، میری محبتیں کے (ایک کو چھوڑ کر) سارے خاکے، عہد ساز شخصیت کے مضامین، دو کو چھوڑ کر باقی سارے انشایئے اور قصے کہانیاں کے بارہ میں سے ۶ افسانے (کاکروچ، روشن نقطہ، شناخت، ۲۷۵۰ سال کے بعد، انکل انیس، بابا جمالی شاہ کا جلال) پاکستان کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے بلکہ مختلف ادبی رسائل میں یہ ساری تحریریں چھپ بھی چکی تھیں۔ دو شعری مجموعے، ماہیے پر تحقیق و تنقید کی کتب، سفرنامہ اور یادیں، یہ خالصتاً جرمنی میں آنے کے بعد ہوئے ہیں''۔(۲) جرمنی آنے کے بعد بھی ان کی کتابیں پاکستان اور ہندوستان سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔

**حیدر قریشی کی تصانیف مختلف ملکوں میں شائع ہو چکی ہیں:**

۱۔ نیشنل سطح پر: کراچی، حیدرآباد، اسلام آباد، خیر پور میرس، کوئٹہ، بہاول پور، لاہور، فیصل آباد، سرگودھا، راول پنڈی، پشاور اور ملتان

۲۔ انٹرنیشنل سطح پر: ہندوستان، ماریشس، برطانیہ، جرمنی، کینڈا، امریکہ

**وہ رسائل جن میں حیدر قریشی کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں:**

اوراق (لاہو)، ماہ نو (لاہو)، تخلیق (لاہو)، نگارستان (کراچی)، ادب لطیف (لاہور)، تجدید نو (لاہور)، صدرنگ (اسلام آباد)، نیادور (کراچی)، سیپ (کراچی)، کولاژ (کراچی)، عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)، نیرنگ خیال (راولپنڈی)، شاعر (بمبئی)، گلبن (احمد آباد)، ثم (لکھنو)، توازن (مالے گاؤں)، ادب ساز (دہلی)، اسباق (پونہ)،

..............................

۲۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص، ۸۸۔۸۹۔

اثبات (تھانے)،نردبان (سرگودھا)،اردوزبان (سرگودھا)،کتاب نما (دہلی)،ایوانِ اردو (دہلی)،انشاء (کلکتہ)، محفل (لاہور)،صریر (کراچی)،نگارِ پاکستان (کراچی)،نئی قدریں (حیدرآباد)،علامت (لاہور)،غنیمت (لاہور)، شعروسخن (مانسہرہ)،الفاظ (کراچی)،ارتکاز (کراچی)،جدید اسلوب (سہسرام)،دستک (ہوڑہ)،سبقِ اردو (بھدوہی) مفاہیم (گیا)،خیابان (راولپنڈی)، استعارہ (دہلی)،شمع (دہلی)،بیسویں صدی (دہلی)،ان کے علاوہ اسلام آباد، خیر پور میرس (سندھ)اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے جرنلز میں ان کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جامعہ دہلی کے ''تدریس نامہ''میں بھی ایک مضمون شائع ہوا۔ (نامکمل فہرست)

## حیدرقریشی کا قیام کہاں کہاں رہا:

۱۔ ابتدائی بچپن رحیم یار خان

۲۔ دو برس ربوہ میں

۳۔ زندگی کا بیشتر حصہ خان پور میں گزرا

۴۔ اس کے بعد ایبٹ آباد میں ملازمت

۵۔ دہلی (ہندوستان)

۶۔ ۲۰ سال سے جرمنی میں

## حیدرقریشی کی زندگی کا ایک سال (۱۳/ جنوری۲۰۰۳ء سے۱۳/ جنوری۲۰۰۴ تک)

۱۔ حیدرقریشی ۱۳/ جنوری۲۰۰۴ کو۵۳ سال کے ہوئے۔اس سلسلے میں لکھتے ہیں:''سال کے باون ہفتے ہوتے ہیں اورتاش کے باون پتے ہوتے ہیں۔گردش ماہ وسال تاش کے سارے پتے مجھ پر آزما چکی ہے۔''(۳)

۲۔ ۲۰۰۳ میں منزہ یاسمین نے اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم۔اے کا مقالہ لکھنا شروع کیا۔جو اسی سال اگست،ستمبر تک کتابی شکل اختیار کر گیا۔

۳۔ فروری۲۰۰۳ میں انہیں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج پر جانے کا موقع ملا۔

.......................................

۳۔ حیدرقریشی،عمرلاحاصل کا حاصل،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص،۴۵۹۔

۴۔ دسمبر تک انہوں نے اپنے حج کی روداد لکھی۔جو''سوئے حجاز'' کی شکل میں سامنے آئی۔

۵۔ ۳ غزلیں اور ۳ نظمیں (چلو ایک نظم لکھتے ہیں،محبت کا ایک یادگار دن،مبارک باد اور پُرسہ) لکھیں۔

۶۔ منظر اور پس منظر'' کے عنوان سے کالم لکھا جو اس سال فائل کی شکل میں مکمل ہوئی۔

۷۔ ساختیات اور ماہیا پر مباحث اور ۶ کتابوں پر تبصرے کیے۔

۸۔ دو مضامین''تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر''اور''ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس'' لکھا۔

۹۔ جدید ادب کے از سرِ نو اجراء کا موقع ملا۔اس سال میں دو شمارے پیش کیئے۔اسی سال جدید ادب کتابی صورت میں آنے کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہوا۔www.jadeedadab.com

۱۰۔ دو کلیات فائنل کی۔شعری کلیات''غزلیں،نظمیں،ماہیے'' کا پہلا ایڈیشن ۴ مجموعوں پر مشتمل تھا۔نثری کلیات ''افسانے،خاکہ،یادیں،انشائیے'' ۵ نثری مجموعوں پر مشتمل۔اس سال ۱۲ جنوری ۲۰۰۴ کو دونوں کلیات کی پروف ریڈنگ کی۔

مجموعی طور پر ان تمام کاموں کو دیکھنے کے بعد واقعی اب کوئی شک نہیں کی حیدر قریشی اپنے ۲۴ گھنٹے کو ۴۸ گھنٹے میں بدلنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

### حیدر قریشی کا خاص حلقۂ احباب:

ڈاکٹر وزیر آغا،جوگندر پال،اکبر حمیدی،فرحت نواز،ارشد خالد،ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر نذر خلیق،ڈاکٹر رشید امجد،پروفیسر مظہر مہدی،دیوندر اسر،ہمت رائے شرما،شاہد ماہلی،سعید شباب،عامر سہیل،ڈاکٹر رضیہ اسماعیل،عبداللہ جاوید،شہناز خانم عابدی،ڈاکٹر شہناز نبی،ڈاکٹر عبدالرب استاد،نصر ملک۔

### حیدر قریشی کے ان دیکھے احباب کا حلقہ:

صفیہ صدیقی، امین خیال،نذیر فتح پوری،احمد حسین ماجد،ترنم ریاض،پروفیسر ریاض،ڈاکٹر رضیہ حامد، رؤف خیر،اختر بارک پوری،شمیم انجم وارثی،احمد کمال ہاشمی،جان عالم صاحب،عارف فرہاد،محمد وسیم انجم،اختر رضا

کیکیوٹی،سیدّ ظفر ہاشمی،علامہ شارق جمال،قاضی حسیب،سیدّ اختر الاسلام،شفیق سرونجی،سلیم انصاری،ساجد حمید،غیاث انجم، ناوک حمزہ پوری،ظہیر غازی پوری،محسن بھوپالی،نیاض احمد صوفی ، بشریٰ رحمان، شاہدہ ناز، قاضی اعجاز محور، ذوالفقار احسن،ذکاء الدین شایاں، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،ڈاکٹر جمیلہ عرشی،یعقوب نظامی،ہاجرہ بانو،خورسید علی،خلیق الرحمٰن ،ڈاکٹر عقیل احمد عقیل،ڈاکٹر حامد اشرف،شاہد جمیل،طاہر عدیم،واجد علی،۔( نامکمل فہرست )بقول حیدرقریشی ’’تمام ان دیکھے دوستوں میں سب سے اہم نام خدا کا‘‘۔

## شخصیت:

۱۔ صابر،رحم دل،انصاف پسند، مذہبی انسان ہیں۔

۲۔ مزاجاً بہت میٹھے اور بہت کڑوے ہیں۔اپنے ہر رویہ پر انتہا پسند۔

۳۔ حیدرقریشی جب بھی کسی مسئلے،کسی مسائل پر بات کرتے ہیں صاف گوئی سے بات کرتے ہیں۔ہمیشہ تحقیقی انداز اختیار کرتے ہیں۔

۴۔ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو اسے ختم کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

۵۔ کمپیوٹر اور ٹیلی فون پر انہوں نے ایک وسیع ادبی دنیا قائم کر رکھی ہے لیکن تقریبات اور مجالس میں وہ کم ہی نظر آتے ہیں۔

۶۔ حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو،ان کی انسان دوستی۔وہ دوست نوازی سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔

۷۔ انہیں اونچائی،اندھیرے اور سمندر کے پانی سے ڈر لگتا ہے۔

۸۔ ناامیدی کو کفر سمجھتے ہیں،تصوف سے بھی واقفیت یا شغف رکھتے ہیں۔

## حیدرقریشی اور جرمنی:

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدر
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کو حیدرقریشی کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔وطن عزیز پاکستان کو چھوڑ کر جرمنی منتقل ہوگئے۔اور اس

وقت وہ جرمنی کے قصبہ ہیڑس ہائم میں قیام پزیر ہیں۔جرمنی جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ان کے لیے کہیں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔دوسرے یہ کہ ان کی اہلیہ تین بچوں کے ساتھ جرمنی جا چکی تھیں،تیسرے یہ کہ ان کے افسانوں کے مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' کی اشاعت کے بعد ایک حلقے کی طرف سے کچھ مخالفانہ طرزِ عمل بھی سامنے آیا تھا۔سوایسی صورتِ حال میں ان کے لیے پاکستان سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا جرمنی آنے سے پہلے ایک سال کا عرصہ یونائیٹڈ نیشن کے ادارہ برائے مہاجرین کے تحت ہندوستان (دہلی) میں رہے۔وہیں سے سیدھا جرمنی گئے۔وطن سے جانے کا یہ فیصلہ خود ان کا تھا۔ہاں یہ درست ہے کہ یہ فیصلہ انہوں نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا۔

## وطن سے دور رہ کر ان کی تحریر میں آنے والی تبدیلی:

حیدر قریشی نے اپنی زندگی میں کافی مشکل وقت دیکھا۔جرمنی آ کر فکر میں کچھ حد تک تبدیلی ضرور آئی لیکن وہ اپنی جڑوں سے نہیں کٹے، بلکہ اپنی بنیاد سے جڑے ہوئے ہیں۔اپنی بنیاد پر رہتے ہوئے ان کی سوچ میں وسعت آئی اور ذہنی کشادگی بھی ہوئی ہے۔ماضی کی یادوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے وہ آج زندگی کے اِس مقام پر ہیں۔ان کی تخلیقات ان کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ جرمنی آ کر آسائشیں تو میسر ہوئی،لیکن اداسی بڑھ گئی۔ کہتے ہیں: ''کبھی کبھی اپنے شہر کی گلیوں کے پتھر اور روڑے بھی شدت سے یاد آتے ہیں ممکن ہے رزق کی فراخی اور وطن کی یاد کے اثرات میری تحریریں میں آنے لگے ہوں''۔(۴) حیدر قریشی اپنی ذات کو بٹا ہوا محسوس کرتے ہیں۔اس کے لئے اپنا ہی ایک مصرعہ اکثر گنگناتے ہیں۔

روگ سمجھا ہے کوئی کب کسی دیوانے کے
آدھے ہم تیرے ہیں ، آدھے کسی بیگانے کے

اپنے ملک سے دور اپنی زبان سے دور ہونے کا دکھ اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ انسان لاکھ آسائشوں میں گھرا ہو وہ اپنے ملک کی یاد سے غافل نہیں ہو پاتا۔حیدر قریشی بھی کچھ اسی قسم کی دلی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں:''یہ جو میں بار بار شروع سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے ماضی سے وابستگی ، اپنی مقامیت سے وابستگی اور اپنی جڑوں سے وابستگی ،تو یہ پاکستان واپس جانے کی ہی بات ہو رہی ہے۔یعنی اپنے گھر کا یاد آنا،گلیوں کا یاد آنا ، even وہ جو اپنے گھر کی گلی

.......................................

۴۔ سعید شباب،(مرتب)،انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴،ص، ۴۷۔

میں ہوائی چپل پہنے ہوتے اور کوئی پتھر پاؤں سے ٹکرا جاتا اور انگوٹھا زخمی ہو جاتا، مجھے تو اب وہ پتھر بھی یاد آتا ہے۔اس پتھر پہ پیار آتا ہے جس نے زخمی کر دیا تھا۔'' (۵) صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو حیدر قریشی تنہائی پسند انسان ہیں۔انہیں لکھنے کی تحریک خود اپنی ذات سے ملتی ہے ان کے لئے وطن کوئی بھی ہو تخلیقی احساس کی بنیاد میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔ جرمنی میں ادبی ماحول نہ ہونے کے باوجود حیدر قریشی نے خود کو ادب کی راہ پر گامزن رکھا۔کہتے ہیں: ''یہاں آنے کے بعد جب زندگی کے بعض تفکرات سے چھٹکارا ملا تو مجھے تو بہتر طور پر ادبی اور تخلیقی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔'' (۶)

## وہ کام جو مستقبل میں کرنے کی خواہش رکھتے ہیں:

۱۔ حیدر قریشی مستقبل میں ناول (درجہ دوم کا شہری) لکھنے کے خواہش مند ہیں۔(۷)

۲۔ مستقبل میں ابنِ صفی پر کام کرنے کی خواہش ہے۔

## حیدر قریشی کی پسند:

افسانہ نگار: پریم چند، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، رشید امجد، احمد جاوید۔

انشائیہ نگار: ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، مشتاق قمر، اکبر حمید۔

پسندیدہ کتاب: ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اک کتھا انوکھی' اور ''شام کی منڈیر سے''۔

پسندیدہ شخصیت: ڈاکٹر وزیر آغا۔

پسندیدہ خوشبو: چمبیلی، گلاب، صندل اور رات کی رانی۔

پسندیدہ موسیقی: سہگل کے دور سے لے کر ۱۹۷۵ء کے زمانے تک کی موسیقی۔

پسندیدہ رنگ: ہلکا سبز، کریم اور پیازی رنگ۔

پسندیدہ مضامین: عربی، اردو۔

پسندیدہ اساتذہ: مولوی خدا بخش صاحب (عربی)، سیکنڈ ہیڈ ماسٹر، صدیق صاحب۔احمد بخش فریدی صاحب۔

.......................................

۵۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴، ص، ۱۷۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۷۔ ایضاً، ص، ۴۸۔

پسندیدہ کھیل: گلّی ڈنڈا، لوڈو، بارہ ٹہنی، نوٹہنی۔

ایک حساس شاعر یا ادیب حالاتِ زمانہ یا اپنے اردگرد کے ماحول اور واقعات سے الگ نہیں رہ سکتا۔خوش گوار حالات اطمینان بخشتے ہیں اور برے حالات غمزدہ کر دیتے ہیں۔خوشی اور غم زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔اسی کی ترجمانی شاعر یا ادیب اپنی فنکاری کے ذریعہ کرتا ہے۔ذیل میں بعض ایسے فکری و ادبی ماحول کا مجموعی جائزہ پیش کیا جارہا ہے جو کہ حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں۔

## فکری وادبی ماحول:

تحریکات، رجحانات اور رویے زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ان سے جہاں زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے، جمود ٹوٹتا ہے، یک رنگ فضا ختم ہوتی ہے وہاں نئی معنویت اور نئی صداقت فروغ پاتی ہیں۔اور نئے نظریات و افکار کا راستہ کھل جاتا ہے۔شخصی رویے تو اپنی محدودیت کی بنا پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہو پاتے لیکن رجحانات اور تحریکوں کے اثرات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔بالخصوص تحریکیں اپنے ارتقاء کے مراحل میں جو کچھ سامنے لاتی ہیں اس کا اثر موجود عہد پر بھی ہوتا ہے۔بعد میں بھی یہ اثرات جاری و ساری رہتے ہیں۔رجحان کا اثر عموماً وقتی ہوتا ہے لیکن شدت میں اس کا درجہ کسی بھی تحریک سے کم نہیں۔نظریات اگر ایک ضابطہ میں ڈھل جائیں تو تحریک بن جاتی ہے اور اگر نہ ڈھلے تو ماحول بدلتے ہیں اور اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔رجحان جس شعبے سے متعلق ہوتا ہے اس میں اثر دکھاتا ہے۔مذہبی رجحانات صرف مذہب، معاشرتی رجحانات صرف معاشرت اور ادبی رجحانات صرف ادب تک ہی محدود رہتے ہیں جب کہ تحریک کسی ایک شعبہ زندگی سے متعلق ہو کر بھی محض اس تک محدود نہیں ہوتی بلکہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔موزوں ہوگا کہ مجموعی طور پر چند فکری تحریکوں کا جائزہ بھی پیش کیا جائے۔جس سے افسانہ نگار کی افسانہ نگاری کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

انسان دوستی (Humanism)، آزاد خیالی (Liberalism)، عقلیت پسندی (Rationalism)، قوم پرستی (Nationalism) جیسی فکری تحریکوں کے علاوہ رومانیت، مارکسیت (Marxism)، جدیدیت (Modernism)، وجودیت (Existentialism)، مابعد جدیدیت (Post Modernaism) نے بھی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے انسانی ذہن کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔قیام پاکستان کے وقت ترقی پسند تحریک پورے دم خم کے ساتھ موجود تھی اور اچھا لکھنے والوں کی ایک موثر تعداد اس سے وابستہ تھی۔ترقی پسند تحریک نے موضوعات ہی کو وسعت نہیں دی بلکہ بیانیہ حقیقت نگاری میں بھی مختلف تجربات کئے۔نئی ادبی بحثیں سامنے آئیں۔ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں موضوعاتی دائرے کو معاشرے کی نچلی سطح تک پھیلا کر ادب اور زندگی کے رشتوں کو وسیع اور مضبوط کر دیا۔موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب و اظہار پر بھی اثر ہوا۔حقیقت نگاری میں اظہار و انداز کے نئے پیرائے وجود میں آئے۔ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ رومانی تحریک کے اثرات بھی قائم رہے لیکن بیسویں صدی کی نئی ادبی بحثوں اور نئے اسالیب (جس کا زیادہ اظہار نظم میں ہوا) نے اپنا اثر ڈالا اور ترقی پسند اور رومانیت پسند دونوں لکھنے والوں کے یہاں اسلوب و انداز اور اظہار کی تبدیلیاں ہوئیں۔حلقہ ارباب ذوق جس نے کہ ایک رجحان اور رویے کے طور پر اپنے اثرات پیش کیے۔ابتدا میں حلقہء ارباب ذوق کو ترقی پسند تحریک کا ردعمل سمجھا گیا۔لیکن حلقہ کے ابتدائی جلسوں میں بعض ترقی پسندوں کی شرکت نے اسے غلط ثابت کیا۔حلقہ صرف ادبی وفنی اقدار اور جمالیاتی اقدار کی پاسداری کا مطالبہ کرتا تھا۔موضوعات کی حد بندی کا قائل نہ تھا۔جنگ عظیم دوم کے عالمی پس منظر میں ہونے والی شکست کا اثر برصغیر پر بھی پڑا۔اقتصادی بحران و بے روزگاری اور سماجی عدم تحفظ نے نئے نئے موضوعات کو متعارف کروایا۔ان نئے مسائل نے اظہار و اسلوب پر بھی اثر ڈالے۔قیام پاکستان کے بعد موضوعاتی اعتبار سے جو تبدیلی آئی وہ کچھ اس قسم کی تھی:۔

۱۔ فسادات کا المیہ، محرومی اور انسانی جانوں کے زیاں پر دُکھ اور غم۔

۲۔ ہجرت کا دُکھ، زمین اور آبائی گھروں کی یاد، جس نے ایک قسم کی تنہائی اور مایوسی کو جنم دیا۔

۳۔ نئی مملکت کے بارے میں ٹوٹتے خواب کا کچھ عرصہ بعد ہی احساس ہونے لگا کہ جس بڑے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی دی گئی ہے وہ ابھی دور ہے اور لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا نظام وجود میں آیا۔

واقعاتی سطح پر فسادات کا المیہ افسانے میں کئی اچھی کہانیوں کا موضوع بنا۔ہجرت کا دُکھ اور تنہائی افسانے اور شاعری دونوں میں مختلف صورتوں میں نظر آئی۔اسی دور میں پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تحریک بھی سامنے آئی۔اسلامی ادب کی تحریک قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر سامنے آئی۔اسلامی تعلیمات اور اسلامی

نظریہ حیات کی اردو ادب میں ترویج و ترقی اور غیر اسلامی نظریات و افکار سے انحراف، تحریک کے بنیادی مقاصد میں سے تھا۔ پاکستانی عوام کی ذہنی تربیت اور اخلاقی و مذہبی قدروں کی پاسداری کے اس منصوبے کا آغاز باقاعدہ، منظّم اور شعوری کوششوں کے ساتھ ہوا۔ تنظیمی طور پر ترقی پسند تحریک کو مثال بنایا گیا اور زیادہ تر ایسے ذرائع اختیار کیے گئے جو انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے آغاز میں استعمال کیے تھے۔ تحریک ادب اسلامی کا مرکزی دائرہ اسلام کے بنیادی عقائد، روحانیات اور عبادات و معاملات سے متعلق تھا اور اس کا میلان زیادہ تر تبلیغی تھا۔ عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> بلا شبہ اسلامی ادب تبلیغی ہے۔ اس کا ایک اعلیٰ مقصد اور وسیع افادہ ہے اور وہ اس سے کم کوئی چیز نہیں کہ انسانی زندگی اپنی تمام تہوں کے ساتھ نکھر جائے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ سنور جائے۔ یہاں تک کہ اس حد یں زوال و فنا کی سرحدوں سے آگے بڑھ جائیں اور اس کا عروج سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ جائے۔ (۸)

اسی زمانے میں پاکستانی ادب کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ پاکستانی ادب کی تحریک میں اس کے برعکس تہذیبی و تاریخی ارتقاء کو اہم سمجھا گیا۔ اردو افسانے پر تحریک ادب اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریکوں کا براہ راست تو کوئی اثر نہیں پڑا تاہم بلواسطہ طور پر اس کے آثار موجود ہیں۔ یہ آثار افسانے میں پاکستانی ماحول، پاکستانی معاشرے کے جذبات و احساسات اور فکری و ذہنی رویوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ اسلامی حوالوں سے مسلم تشخص، مسلم ثقافت و تہذیبی پس منظر ،تصوف، روحانیت اور اسلامی فکر کے تاریخی ارتقاء کے عناصر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

> پاکستانی ادب کی تعمیر کرنے والے تخلیقی سطح پر کوئی قابل ذکر کام نہ کر سکے اور یہ موضوع صرف تنقیدی بحثوں تک محدود رہا۔ اسی طرح اسلامی ادب کی بات کرنے والے بھی ادبی معیار اور جمالیاتی اقدار کی اعلیٰ سطح کو نہ چھو سکے اور اسلامی ادب لکھنے والے کبھی بھی ادباء کی فہرست میں شامل نہ ہو سکے۔ ان کی حیثیت دوسرے درجے کے لکھنے والوں ہی کی رہی جن کا ذکر قابل ذکر تنقید میں کبھی نہ آسکا۔ (۹)

یہ تحریکیں ایک مخصوص عہد میں نمایاں ہو کر معدوم ہو گئیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریکیں کبھی مرتی نہیں بلکہ اپنا معنوی قالب بدل لیتی ہیں اور مدتوں ان کے آثار باقی رہتے ہیں۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد جب ہنگامی حالات کی گرد بیٹھی تو ان تحریکوں کی معنویت بھی ایک نئے انداز سے سامنے آنے لگی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی اور اس کے بعد

............................................

۸۔ خلیق انجم، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۰۔
۹۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

اگر چہ اردو افسانہ میں جدیدیت کا رجحان غالب رہا اروموجود حالات و ماحول کے مطابق افسانے کے قالب میں تبدیلی آئی لیکن ماضی قریب کی تحریکوں کے زندہ معنوی عناصر سے بھی استفادہ کیا گیا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں موضوعاتی اورفنی دونوں سطحوں پر بڑی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔سیاسی حالات کی ابتری نے ایک قومی بے سمتی کوجنم دیا۔چنانچہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جونسل سامنے آئی اس نے خود کواعلانیہ غیرنظریاتی کہا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسندتحریک کی وجہ سے خارجی حقیقت نگاری کا جو رجحان پروان چڑھا تھا وہ داخل کی طرف آ گیا۔ کردار سائے بن کر بے نام ہوئے اورٹھوس واقعات کے بجائے خیال اور آئیڈیا کہانی میں اہم ہوئے۔نئی لسانی تشکیلات ، استعارہ سازی کا نیا تصور، علامت و تجرید کی بحثیں موضوعات پر حاوی ہوگئیں۔ ہیئت وتکنیک کے نئے تجربوں اور اسلوب و اظہار کے نئے انداز نے تفہیم و ترسیل کے مسائل پیدا کئے۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنی کتاب ''افسانے کا منظر نامہ'' میں رقم طراز ہیں:

> کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ نئے افسانے کے آغاز کا زمانہ ہے۔اس لیے کہ پہلے پہل اسی زمانے میں نئی اور پرانی نسل کے تنازعے نے سر اٹھایا تھا اور نئے ادب کا نام لینے والوں نے فکری اختلافات کے باعث ہر سطح پر ہر چیز کی نفی کی۔مروجہّ اقدار،سماجی اخلاقی پابندیوں سے انحراف کیا۔یہ زمانہ ترقی پسندتحریک کے آخری سانس لینے کا زمانہ ہے اور جدید نسل کا ظہور۔''(۱۰)

معاشرتی سطح پر بے سمتی اور عدم فکر کا زمانہ تھا۔سیاسی نظام کی جگہ لینے والا مارشل لائی نظام ناکام ہوگیا تھا اور صورت حال کو بدلنے کے تمام دعوے غلط ثابت ہوگئے۔اس بے سمتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظریات کی اہمیت کم ہوگئی اور تکنیک اور ڈھانچہ پر زور دیا جانے لگا۔افسانے میں علامت وتجرید نے پرانے ڈھانچے کو بدل دیا۔انتظار حسین نے اگر چہ داستانی لہجے اور کرداروں کی مدد سے روایت کوقائم رکھنے کی ایک سعی کی لیکن انور سجاد کے انداز نے نوجوان نسل کو متاثر کیا۔اس دور کی ساری ادبی بحثیں جدیدیت کے اسی نئے تصور کے گرد گھومتی ہیں۔۱۹۶۰ء کی دہائی میں زمین سے وابستگی کا ایک رجحان بھی سامنے آیا۔اس کے محرک وزیر آغا تھے۔اس رجحان نے ادب میں پہلی بار اپنی زمین کی اہمیت کا احساس پیدا کیا۔وزیر آغا ادب میں نئے تجربوں اور نئے اسلوب کے حامی تھے اس لیے انہوں نے اظہار کے ان نئے رویوں کا استقبال کیا۔

..............................

۱۰۔مرزا حامد بیگ،افسانے کا منظر نامہ،لاہور:اورینٹ پبلیشرز،۲۰۱۲ء،ص ۱۰۲

جدید افسانے نے کہانی کے مروجہ فارمولے کو توڑ کر اسے ایک نئی شکل عطا کی ۔اس عمل کو اینٹی اسٹوری کا نام دیا گیا۔افسانہ نگاروں نے روایتی ترتیب اور انضباط سے بھی انحراف کیا۔واقعاتی تسلسل کی بجائے خیال واحساس کے تسلسل کو اہمیت دی گئی۔ظاہر ہے خیال واحساس کی حیثیت باطن کی ترتیب وتنظیم خارج سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔جدید افسانے میں کرداری حوالے سے بنیادی تبدیلی جسم کی بجائے سائے کو ترجیح دینا ہے۔یہ اس وقت ہوتا ہے جب ذات کا تصور دھندلانے لگے، شناخت گڈمڈ ہو جائے اور لا حاصلیت و بے معنویت کا تصور رگ و پے میں سرایت کر جائے۔قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں معاشرتی الٹ پھیر، سیاسی گھٹن اور منافقتوں وجعلسازیوں کی بدولت یہ المیہ نئی نسل کا مقدر بنا، مارشل لاء کے نفاذ نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور سب سے بڑھ کے مغرب سے آمدہ انحطاطی فکری عناصر مجموعی طور پر لاتعلقی اور اجنبیت کا باعث بنے۔اس صورت حال میں کردار کا بے نام ہو جانا اور شناخت کی گمشدگی ایک فطری امر تھا۔جدید افسانہ نگاروں کے ہاں بے چہرہ کرداروں اور پرچھائیوں کی پیش کش عصری زندگی کے اسی المیے کی بازگشت ہے۔جدیدیت کا رجحان اگرچہ ساختیاتی تبدیلی سے متعلق تھا لیکن ترقی پسندوں کی مخالفت میں اس نے خارجیت اور اجتماعیت کی بھی نفی کی اور افسانے میں داخلیت اور شخصی حوالوں کو زیادہ اہم سمجھا۔اس حوالے سے تصوف سے بھی استفادہ کیا گیا لیکن زیادہ تر وجودی نظریات رہنما بنے۔نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ فکری طور پر انسان کی بے بسی اور زندگی کی بے معنویت کا نوحہ بن کر رہ گیا۔زندگی کی مثبت قدروں اور انقلابی رویوں کی طرف توجہ کم رہی اور سماجی زندگی کے خارجی حوالے بھی افسانوی افق سے رفتہ رفتہ غائب ہو گئے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز ہی میں معاشرتی اور سیاسی طور پر مارشل لاء کے خلاف ایک بڑا ردِعمل سامنے آیا۔خود کو اعلانیہ غیر نظریاتی کہنے والوں نے نظریہ کی بات شروع کر دی۔وہ تمام لکھنے والے جو ذات کی تشخیص اور دوسری ذات کی تلاش کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے باطن سے خارج کی طرف مائل ہوئے۔تجریدی اور علامتی رویہ میں ایک اعتدال آیا۔انتہا پسند اسلوبی رویے ایک متوازن انداز میں تبدیل ہوئے۔۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران کئی اصناف کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ان میں انشائیہ، نثری نظم اور ہائیکو اہم ہیں۔لیکن نثر میں زیادہ توجہ افسانے اور شعر میں نظم اور غزل کی طرف رہی۔فنی سطح پر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں جو تبدیلیاں آئیں ان میں نئی لسانی تشکیلات کے اثرات ہیں۔تراکیب اور اضافتوں سے گریز کیا گیا جس وجہ سے شاعری کی زبان میں تبدیلی آئی۔افسانوی زبان

میں شعریت کے شامل ہونے سے بیانیہ کے مقابلے میں ایک نئی زبان تخلیق ہوئی۔علامت و استعارے کے ساتھ ساتھ افسانوں میں امیجز اور تمثیل کاری نے بھی جگہ پائی۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں مارشل لاء پھر لگایا گیا جس کے دوران ۱۹۷۹ء میں بھٹو کو پھانسی دی گئی۔یہ مزاحمتی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔مارشل لاء کے آٹھ ماہ بعد مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ ''گواہی'' شائع ہوا۔اس میں ۱۴ کہانیاں شامل تھیں۔اس مجموعہ میں احمد جاوید، احمد داؤد، اعجاز راہی، انور سجاد، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، منشا یاد اور مظہر الاسلام کے افسانے شامل تھے۔اظہار و بیان میں کھلا پن آ گیا۔کہیں کہیں بیانیہ بھی اختیار کیا گیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب اس میں سادہ بیانیہ کی بجائے نیم استعاری انداز بھی شامل ہو گیا۔مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> ''ان افسانوں میں مارشل لاء کی جبریت کے خلاف نفرت کا سمندر موج زن ہے۔ہر ہر لفظ کے ورتارے میں شدید تیزابیت گھلی ہوئی ہے۔یہ نفرت اور جھنجھلاہٹ انسانی ہاتھوں کی پھولی ہوئی نسوں اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ تخلیق کار کے اظہار میں اپنی واضح پہچان کرواتی ہے۔''(۱۱)

جدیدیت کے دور سے گزرتا ہوا اردو افسانہ مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہوا۔یہ دور آٹھویں دہائی کا دور تھا۔اس دور میں خاصی تبدیلیاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر رونما ہوئیں اس سے زندگی میں بھی خاصا بدلاؤ آیا۔۔زندگی میں نئے مسائل کی وجہ سے آج افسانوں کے موضوعات یکسر بدل چکے ہیں۔اسلوب پر بھی اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔آج کی دنیا روز بہ روز سمٹتی جا رہی ہے۔ہزاروں میل دور کی خبریں، پل بھر میں ہمیں مل جاتی ہیں۔دنیا بھر میں ہو رہی آفت ناگہانی نے ہر گھر میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔زندگی بہت پیچیدہ ہو چکی ہے۔مسائل گنجلک ہو گئے ہیں، خاندان ٹوٹ گئے ہیں، فرد سمٹ گیا۔سچائی، ضمیر، ایمانداری اور روح جیسی چیزوں کا زیادہ نام نہیں لیا جاتا۔ان حالات میں افسانہ نگار کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کس موضوع کو اپناتا ہے۔اصل افسانہ وہ ہوگا جسے افسانہ نگار حقیقی سمجھے گا اور جو قاری کے اندر تک پہنچے گا۔یہاں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ افسانہ سیدھے سادھے سپاٹ انداز میں لکھ دیا جائے۔آج کا افسانہ مختلف قسم کی illusion سے کافی حد تک باہر نکل آیا ہے۔علامتی افسانے آج بھی لکھے جا رہے لیکن آج کے انداز میں۔افسانہ کے موضوعات آج کے سلگتے ہوئے مسائل ہیں۔یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا

---

۱۱۔ مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، لاہور: اورینٹ پبلیشرز، ۲۰۱۲، ص ۱۰۵

افسانہ ماضی سے نکل کر بھی ماضی کی مشعل کو ہاتھوں میں لئے ہوئے ہے۔مابعد جدیدیت کے زیر اثر نفسیات،سرریلزم،میجک ریلزم وغیرہ پر توجہ،علامتی پیچیدگی سے گریزاور سیدھے سادے ڈھنگ سے قصہ گوئی کا رجحان بڑھا۔آٹھویں دہائی کے بعد ایک ایسا طریقہ اظہار بھی ابھر کے سامنے آیا جس کی بنیاد میں حقیقت اور تخیل دوونوں کا امتزاج ہے،نئے افسانے میں زبان کے استعمال کا حاوی رجحان حقیقت پسند اصولوں کا پابند نظر آتا ہے۔ یعنی موضوع ، ماحول اور کردار کی نوعیتیں ہی زبان کی نوعیت کا تعین کرتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ذہنی طور پر فعال اور باطنی اضطراب کے باعث نئی نسل نے خود اپنی مرضی سے منزل کا تعین کیا۔آج کے افسانہ نگاروں نے عصری زندگی اوراس کے مسائل کی عکاسی بھر پور انداز میں کی۔محسوسات کی سطح پر تمام تر تبدیلیوں کے ردعمل کو بغیر کسی کی تقلید کے آزادانہ طور سے افسانے کے فن کو سنوارا۔بندھے ٹکے دائرے سے باہر آکر زندگی کے ایک بڑے کینوس پر جدید افسانہ نگاروں کی نگاہ مرکوز ہے۔انہیں اس بات کا احساس زیادہ ہے کہ وقت کی دوڑ میں اردو ادب کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔اس طرح دیکھا جائے تو جدید افسانہ مستحکم روایات کا پاسدار اور روشن مستقبل کا ذمہ دار ہے۔اردو افسانہ کی اس نئی نسل میں انور خاں ، نیر مسعود،عبدالصمد،سلام بن رزاق،مرزا حامد بیگ، علی امام نقوی،مظہرالزماں خان،ذکیہ مشھدی،قمراحسن،خالدہ اصغر،وغیرہ کے نام قابل ذکر ہی۔ نئے دور میں لکھی گئی کہانیوں کے امتیازات کونشان زد کرنے لے لیے ان پر ترقی پسندی ، جدیدیت یا مابعد جدیدیت کا لیبل لگانا ضروری نہیں۔

## حیدرقریشی کی ابتدائی ادبی زندگی:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر وترقی کا انحصاراس کے ماحول وفضا اورنسلی واجتماعی شعور پر ہوتا ہے۔انسان کی شخصیت سازی میں اس کا ذہنی میلان ،گھریلو ماحول اور اردگرد کے حالات اہم رول ادا کرتے ہیں۔حالات اسے بناتے بھی ہیں، بگاڑتے بھی۔ جب کوئی شخصیت ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بالغ نظری کی منزل پر پہنچتی ہے تو پھر اپنی شناخت اور انفرادیت کے نشان رقم کرنے کی خواہش اس کے دل ودماغ میں گھر کرنے لگتی ہے۔اس کے لیے وہ ایسے عملی راستے اختیار کرتی ہے جس سے اس کی انفرادیت کو جلا ملے ۔حیدرقریشی ایک ایسی ہی

شخصیت ہیں جس نے حالات کے ہاتھوں ایک مدت تک پریشانی دیکھی ۔انہوں نے اپنے ماحول وسماجی رسم و رواج سے ہٹ کر ایک الگ راہ منتخب کی جو مشکل تو تھی مگر ان کی مسلسل محنت نے انہیں اردو ادب میں ایک مقام دیا۔تعلیم کے دوران حیدرقریشی اوران کے گھر والوں کو سخت مالی مسائل سے دو چار ہونا پڑا۔حیدرقریشی اپنے ان حالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ بے حد بھیانک غربت کی زد میں آئے ہوئے تھے۔سردیوں کے دن آرہے تھے اور میرے پیروں میں ہوائی چپل تھی۔تب خالہ حبیبہ نے اپنے پرانے ''کوٹ شوز'' مجھے دیدیئے۔ خالہ حبیبہ کے پاؤں ہمیشہ سے چھوٹے رہے ہیں۔اس لیے مجھے وہ ''کوٹ شوز'' پورے آگئے۔اور میری سردیاں آرام سے گزر گئیں۔۔گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے میری یہ عادت بن گئی کہ نئے تعلیمی سال پر اپنی پچھلی سال کی کتابیں سیکنڈ ہینڈ پر بیچ دیتا اور نئی کلاس کی کتابیں کسی اپنے جیسے لڑکے سے آدھی قیمت پر خرید لیتا۔(۱۲)

حیدرقریشی کا میلان بچپن ہی سے اردو ادب کی جانب رہا،اس میں ان کے خاندانی ادبی ذوق کا بھی بڑا حصہ رہاہے۔اس سلسلے میں حیدرقریشی لکھتے ہیں:

میری بالکل ابتدائی ادبی تربیت میں میرے خاندان کے تین اہم افراد کا لاشعوری عمل دخل رہا۔ان کا میں اپنی بعض تحریروں میں ہلکا سا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اباجی نے مجھے اسکول جانے سے پہلے جس طرح اردو پڑھنا،لکھنا سکھا دیا تھا وہ میری ادبی تربیت کا پہلا زینہ تھا۔ پھر امی جی کا گھر میں دلچسپی لے کر ناول پڑھنا بھی مجھے ادب کے ساتھ جوڑنے کا ایک سبب بنا۔پھر میرے بچپن میں ہی ماموں حبیب اللہ صادق کا شاعر ہونا۔میں سمجھتا ہوں میرے بچپن کے یہ سارے عوامل میری ادبی تربیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔(۱۳)

ابتدا ہی سے حیدرقریشی میں تخلیقی صلاحیت موجود تھی۔لکھنے پڑھنے کے شوقین حیدرقریشی نے ۱۹۶۸ میں ایک چھوٹا سا ناول لکھا جو دراصل اس وقت ان کے دلی جذبات سے زیادہ کچھ نہ تھا۔اس بارے میں حیدرقریشی لکھتے ہیں:

یہ ناول اسکول کی ایک پتلی سی کاپی میں مکمل ہوگیا۔ممکن ہے وہ طویل افسانہ ہولیکن مجھے اس زمانے میں ناول ہی لگا۔ لیکن نہ تو شاید وہ ناول تھا نہ افسانہ۔وہ تو بس میرے اس وقت کے کچے پکے جذبات اور سماجی ناانصافیوں کے زخموں کی

.........................................

۱۲۔ حیدرقریشی،عمرلاحاصل کا حاصل،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص،۴۰۳۔

۱۳۔ ایضاً،ص،۴۵۲۔

کسک کا اظہار تھا۔نیم رومانی،نیم انقلابی قسم کی جیسے میری اپنی کہانی تھی جو میں نے لکھی تھی۔اس کہانی کی ایک ہی خوبی تھی کہ اس کا واحد قاری میں خود تھا اور قاری بھی ایسا کہ جو اسے مکمل کرتے ہوئے شدتِ جذبات سے آبدیدہ ہوتا رہا اور بعد میں اسے پڑھتے ہوئے غم سے روتا رہا۔(۱۴)

حیدرقریشی نے باقاعدہ طور پر اپنی ادبی زندگی کی ابتدا،۱۹۷۱ء میں شاعری سے کی۔پہلے پہل اپنی اس صلاحیت کو سب سے چھپا کر رکھا،بعد میں یہ غزل ہفت روزہ ''لاہور'' میں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی،غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

عقل نے جتنا میری راہ کو ہموار کیا
اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

۱۹۷۴ء میں بزمِ فرید خان پور کے ذریعے زندگی کا پہلا مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا۔حیدرقریشی کو بطور شاعر منظر عام پر لانے والوں میں ان کے دوست جمیل محسن تھے۔جنہوں نے خان پور میں ایک ادبی انجمن ''بزم فرید'' قائم کی تھی۔حیدرقریشی نے جمیل محسن کی فرمائش پر اپنی غزل اس انجمن میں پڑھی۔اس بارے میں حیدرقریشی لکھتے ہیں:

۱۹۷۳ء کا کوئی دن تھا۔جمیل محسن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے ایک ادبی انجمن ''بزم فرید'' قائم کی ہے۔آج شام کو اس کے زیر اہتمام ایک شعری نشست ہو رہی ہے۔آپ بھی اس میں شرکت کریں۔خان پور کے جیٹھہ بھٹہ بازار میں ایک بڑی دکان کے اندر فرشی نشست تھی۔بیس کے لگ بھگ حاضرین موجود تھے۔بڑے احترام کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا۔مشاعرہ شروع ہوا۔جب مجھے کلام سنانے کی دعوت دی گئی،مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔پتا نہیں میں نے غزل کیسے پڑھنی شروع کی اور کیسے مکمل کی اتنا یاد ہے کہ غزل ختم ہونے پر دکان داد سے گونج رہی تھی اور میں پسینے سے تر بتر تھا۔یہ ''بزم فرید'' میں میری پہلی آمد تھی۔(۱۵)

کچھ وقت بعد حیدر قریشی نے بزم فرید کا جائنٹ سیکریٹری اور پھر جنرل سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔بزم فرید کی ترقی کے لیے انہوں نے ہفت روزہ ''مدینہ'' کی خدمات حاصل کیں۔یہی ہفت روزہ ''مدینہ'' حیدرقریشی کے لیے ترقی اور شہرت کا زینہ بن گیا۔کیونکہ بہاول پور کے ہفت روزہ ''مدینہ'' کے ایڈیٹر علامہ منظور احمد رحمت نے حیدر قریشی کو مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کی تحریک کر کے نثر نگاری کی طرف بھی راغب کیا۔حیدرقریشی کا پہلا

..............................

۱۴۔ حیدرقریشی،عمر لا حاصل کا حاصل،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص،۴۵۳۔

۱۵۔ ایضاً،ص،۳۷۸۔

مضمون ۱۹۷۵ء میں ''موجودہ ادبی بے راہ روی'' کے عنوان سے ''نگار پاکستان'' میں شائع ہوا۔خودکونو وارد تصور کرنے والے حیدر قریشی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کونکھارنے کے لئے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو پڑھنا شروع کیا۔ایسے میں وہ ڈاکٹر وزیر آغا سے قریب ہوتے گئے۔'' مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آپاتا، وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔'' (۱۶)

حیدرقریشی کہتے ہیں:

حیدؔر نئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں
رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر سے

بزم فرید سے الگ ہونے کے بعد نذر خلیق، اے۔ کے۔ ماجد اور جمیل محسن کے ساتھ مل کر حلقہء ارباب ذوق کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۷۷ء میں فلمی رسالہ ''سنگیت'' خان پور سے نکالا۔لیکن اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ ۱۹۷۸ء میں خان پور سے ''جدید ادب'' جاری کیا۔جدید ادب کے دورِاول کا پہلا شمارہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اور آخری شمارہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔محدود وسائل اور مالی مشکلات کی بناء پر ''جدید ادب'' کی اشاعت بند ہوگئی۔حیدر قریشی نے جرمنی سے جدید ادب کو دوبارا شائع کیا۔دورِدوم میں صرف دوشمارے نکلے۔پہلا شمارہ مئی ۱۹۹۹ء اور دوسرا شمارہ مئی ۲۰۰۰ء میں سرور ادبی اکادمی جرمنی کے زیر اہتمام شائع ہوا لیکن پھر چند وجوہ کی بنا پر جدید ادب ( جرمنی ) کی اشاعت رُک گئی۔جدید ادب کے ذریعہ حیدر قریشی نے ایک عالمی اردو ادب کی دنیا تخلیق کی ہے۔یہ رسالہ جرمنی میں ان کی نگرانی میں پاکستان پہنچتا ہے وہاں سے تیار ہوکر وہ ہندوستان میں شائع ہوتا ہے۔یہ ایک انٹرنیشنل رسالہ ہے۔

حیدر قریشی اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام و مرتبے کے مالک ہیں وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، نقاد بھی اور مدیر بھی ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ انسان ہیں۔حیدر قریشی کی اس فنی عظمت کے پس پشت ان کا مخصوص ذہنی وفکری رویہ کارفرما نظر آتا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔انہوں نے زندگی کو خود اپنی نظر سے دیکھا اور جیسی بھی وہ انہیں نظر آئی اُسے ویسے ہی پیش

..............................

۱۶۔ حیدرقریشی، عمرلاحاصل کا حاصل، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص، ۳۵۰۔

کر دیا۔انہوں نے تقلیدی روش کو اپنا شعار نہیں بنایا۔اپنے ذاتی تجربات ،مشاہدات اور علم کے جتنے ذرائع تک ان کی رسائی ہوسکی، انہیں بنیاد بنا کر زندگی کے بارے میں اپنی رائے قائم کی ۔حیدرقریشی کے ذہنی وفکری ارتقا کا مطالعہ کرنے کے لیے سیاسی ،سماجی اور ادبی مطالعہ میرے لیے انتہائی دلچسپی اور بصیرت افروزی کا باعث بنا۔

حیدرقریشی نے کبھی بھی اپنے آپ کو ترقی پسندی ،جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ کے حصار میں قید نہیں کیا، بلکہ عصری حسیت سے ہم آہنگ اور داخلی جذبات واحساسات کے جذبے سے سرشار ہو کر مختلف اصناف کےفن کو جلا بخشنے کی سعی کی ہے۔موجودہ سماجی ، سیاسی اور اقتصادی حالات اور ان کی پیچیدگیاں انہیں حد درجہ متاثر کرتی ہیں۔وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کا دائرہ کبھی محدود نہ ہونے پائے اوروہ کسی خاص گروہ میں شمار نہ کئے جائے، بلکہ قارئین کے ایک وسیع حلقے کو اپنے فن کا گرویدہ بنا سکیں اور یہی ایک کامیاب ادیب اور اعلیٰ فنکار کی پہچان ہوتی ہے۔ایک باشعور فنکار کی زندگی مسلسل جدو جہد اور کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔اور وہ اس سطح پر پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔مطالعہ ومشاہدہ کی گہرائی ، عالمی سطح پر کیا کچھ ہو رہا اس کی واقفیت اور چھوٹے بڑے مسائل پر اپنے زاویہ ءنظر سے غور وفکر کرنا ان کا وصف ہے۔

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی کائنات اس کی سوانح ،سماج ،ثقافت اور لمحہ تخلیق سے رشتوں کا تناظر ہوسکتا ہے، جو قاری کی صحیح سمت نمائی کر سکتے ہیں۔حیدرقریشی بھی عام انسان کی طرح زندگی کے کئی تجربات سے گزرے۔وہ ناقابلِ فراموش واقعات اور سانحات ان کی تخلیقات کا حصہ بنے ہیں۔ان کا قاری اپنے مشاہدے ،مطالعہ اور نقد و بصر کے بل بُوتے پر کئی مطلب کی نشان دہی کرسکتا ہے،مگر جب جب وہ ان کی مکمل تخلیقات پڑھے گا تو،اسے ان کی سوانح سے رشتہ قائم کرنا پڑے گا۔

یہاں اس پس منظر کے بیان کا مقصد کسی قسم کی درجہ بندی نہیں بلکہ ان حالات کی نشاندہی کرنا ہے جن میں حیدرقریشی بطور افسانہ نگار اپنی شناخت بناتے ہیں۔

# باب ۔ ۲

# حیدر قریشی کا ادبی سفر مختلف اصناف کے حوالے سے

حیدر قریشی ایک کثیر الجہت تخلیقی فنکار ہیں۔ان کے متنوع اسلوب سے ایک عالم متعارف ہے۔حیدر قریشی بیک وقت شاعر، ادیب، ناقد، صحافی، ماہیا نگار، سفر نامہ نگار، سوانح نگار، محقق، انشا پرداز، خاکہ نگار، اور یادنگار ہیں۔ان کا کل شعری اور نثری سرمایہ کا عوامی ایڈیشن بعنوان'' عمر لا حاصل کا حاصل'' کلیات کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں حیدر قریشی کی شاعری، افسانے، خاکے اور یادیں، انشائیے اور سفر نامہ سے متعلق ۱۱ کتابوں کو یکجا پیش کیا گیا ہے۔اردو میں اس طرح کی پیشکش پہلی بار ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تاثرات کا بیان ان الفاظ میں کیا۔

'' عمر لا حاصل کا حاصل'' ایک انوکھی کتاب ہے جسے ممتاز ہمہ جہت ادیب حیدر قریشی نے یادوں، غزلوں، نظموں، ماہیوں، کہانیوں، انشائیوں، خاکوں اور سفر ناموں کی صورت میں رقم کیا ہے اور ان جملہ جہات کو باہم مربوط کر کے ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری میں ڈھال دیا ہے جو اپنی انفرادیت، گہرائی اور وسعت کے اعتبار سے ایک'' چیزے دیگر'' میں منقلب ہو کر سامنے آ گئی ہے۔شاعری، احساس، متخیلہ اور خیال کے سفر کی داستان ہے اور انشائی تخلیقی سطح کی فکری دریافت کا بیانیہ ہے۔جبکہ کہانی زماں کے مختلف ابعاد کی تصویرکشی کرتے ہوئے باطن اور خارج کے منطقوں کو باہم آمیز کرنے پر قادر ہوتی ہے۔خاکوں اور یادوں کے ذریعے انسان دوسروں سے اپنے تعلقِ خاطر کو منظر عام پر لاتا ہے اور سفر ناموں میں زندگی کے رواں مناظر کو شخصی زاوئے نگاہ سے گرفت میں لیتا ہے۔غور کیجئے کہ یہ سب خودنوشت سوانح عمری کی قاشیں ہیں جنہیں اگر بکھری حالت میں رہنے دیا جائے تو مختلف اصنافِ ادب کی صورت میں دکھائی دیتی ہے لیکن اگر انہیں سلک میں پرو دیا جائے تو ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری بن جاتی ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد اور دلکش ہوتی ہے۔یہی کام حیدر قریشی نے انجام دیا ہے اور ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے اگر ایک زاویے سے دیکھیں تو یہ مختلف اصناف میں منقسم نظر آئے جب کہ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو یہ ایک خیال انگیز، معنویت سے لبریز تصنیف کی صورت میں سامنے آ جائے۔حیدر قریشی نے اپنی اس زندہ رہنے والی کتاب کو'' عمر لا حاصل کا حاصل'' کہا ہے۔غور کیجئے کہ اس عنوان میں لا حاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔ (۱۷)

شاعری سے تخلیقی دنیا میں قدم رکھنے والے حیدر قریشی نے اردو ادب میں مختلف اصناف پر قلم اٹھایا۔

.........................................

۱۷۔ حیدر قریشی، عمر لا حاصل کا حاصل، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص، ۸۰۔

## غزل:

حیدر قریشی نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔بہت جلد انہوں نے ادبی حلقوں میں نام و مقام پیدا کرلیا۔ادبی دنیا میں متعارف ہوتے ہی حیدرقریشی اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنے معاصرین سے بہت مختلف رہے۔حیدرقریشی نے زندگی کا مشاہدہ ومطالعہ طے شدہ نظریوں کی مدد سے نہیں کیا بلکہ یہ آگہی انہیں اپنی ذات میں اتر کرہی حاصل ہوتی ہے۔خارجی و باطنی سطح کی یہ عارفانہ ہم آہنگی اس سارے عمل تفہیم میں شاعر کی ذات کو اپنا میڈیم بنا لیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر آن بدلتی چلی جاتی اس زندگی میں وہ ہمارا شریک حال رہتا ہے اور ہم سے گفتگو کرتا ہے۔۱۹۶۰ء کے بعد پاکستان و ہندوستان کی غزل نے قدیم شعری روایتوں سے بغاوت کا اعلان کیا۔موضوعات و مضامین، افکار، میلانات و تجربات اور رجحانات و اسالیب میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا۔غزل گو شعراء اپنے دامن میں معاشرے کی ہمہ وقت بدلتی ہوئی صورت حال کو سمیٹے ہوئے تھے۔حیدرقریشی کی شاعری میں بھی وہی بے قراری ہے،تڑپ ہے، زندگی سے مقابلہ ہے،غم کی کسک ہے۔وہ اپنی غزل سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کے اشعار ان کی شخصیت کو ابھارتے ہیں ان کے غم کی عکاسی کرتے ہیں ان کی خوشیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سبھی استعارے ،علامتیں بھی بجا ہیں اُس کے لئے مگر
وہ تو آپ اپنی مثال ہے ، وہ تو آپ اپنی دلیل ہے

میں کوئی رامؔ نہ گوتمؔ ، حیدر اک شاعر آوارہ
پھر یہ کیسی خواہش ہے جنگل میں لےلوں جوگ

اسے کون ہے جو بجھا سکے
یہ چراغ اپنی ہوا میں ہے

حیدرقریشی غزل کی روایت سے پوری طرح باخبر ہونے کے علاوہ اس سے حتی الامکان استفادہ بھی کرتے ہیں ۔لیکن اس روایت کے علاوہ بھی ان کے کلام میں بہت کچھ نظر آتا ہے۔جو انہیں لکیر کا فقیر ہونے یا کسی کی تقلید میں اپنی انفرادیت کھو دینے سے بچا لیتا ہے۔ان کی غزل میں اپنی بات ایک نئے انداز سے کہنے کی امنگ ہے۔بدلتی ہوئی قدروں اور نت نئے سانچوں میں ڈھلی زندگی کی بھر پور تصویر ہے۔حیدرقریشی نے ابھی تک کل ۱۶۳ غزلیں کہیں ۔جوان کے شعری مجموعوں **''سلگتے خواب''**، **''عمرِ گریزاں''**، **''دعائے دل''** اور **''درد سمندر''** میں شامل ہیں۔ حیدرقریشی کی شاعری داخل وخارج اور ذات وکائنات کے ہمہ رنگ احساسات و تاثرات کا خوبصورت امتزاج ہے۔انہوں نے اپنے اردگرد پھیلی کائنات اور حقیقی زندگی کی تلخیوں کا بغور مطالعہ کیا ۔حیدرقریشی کی شاعری میں فکر کے سوتے ان کے ذاتی مشاہدے اور تصوف کے نظام فکر سے پھوٹتے ہیں۔حیدرقریشی کا مشاہدہ عمیق اور وسیع ہے۔اپنی ذات اور اپنے نظریات کو غزل میں بڑی بے تکلفی سے پیش کیا۔ان کی زندگی ان کے احباب کے لیے کھلی کتاب سی ہے۔زندگی کے ابتدائی ایام میں انہوں نے تلخ حقیقت کا سامنا کیا۔کہتے ہیں:

اس زندگی کی ساری حقیقت ہے اک فریب
ہم تیرتے رہیں گے سرابوں کی جھیل میں

تمہیں تو گردشِ دوراں نے روند ڈالا ہے
رہی نہ کوئی بھی پہلی سی بات آنکھوں میں

زندگی کی ہر برہنہ شاخ پر تحریر ہیں
پھول چہروں پر جو ٹوٹے زرد لمحوں کے عذاب

حیدرقریشی کی شاعری میں نہ تو جنسی محبت کا شدید اظہار ہے اور نہ ہی متصوفانہ عشق کا بلکہ انہوں نے ان دونوں کے بین بین اپنے لیے ایک نئی راہ تراشی ۔ایک ایسی راہ جو ان کے شعور کی پختگی اور ان کے عشق کی عظمت اور

فعالیت کا احساس دلاتی ہے،اور تکمیل انسانیت کے جذبہ کو پورا کرتی ہے۔حیدرقریشی کی شاعری میں تیکھے،شوخ اور مدہم رنگ یکساں ہیں۔حسن و جمال ،جذبات و احساسات ،تفکر اور کسی حد تک تصوف کے عناصر ایک ہی لڑی میں پروئے ملتے ہیں۔ان موضوعات کو برتنے میں حیدرقریشی کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹی نظر نہیں آتی بلکہ یہ سارے موضوعات ایک ہی شخصیت کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں چھپے نظر آتے ہیں اور انہیں موضوعات کے خدوخال سے حیدرقریشی کی غزل کا سراپا جنم لیتا ہے۔غزل اس کیفیت کی تخلیق ہے جب بات کی ضرورت ہوتی ہے۔اور بات کے بھی سو رنگ۔کہیں سرگوشی ،کہیں شوخی،کہیں بلند آہنگی ،کہیں آواز میں خفگی اور شکایت کا انداز،کہیں جینے کی امنگ اور کہیں کسی گہرے ملال میں ڈوبی ہوئی آہستہ آہستہ کہی جانے والی کوئی بات۔افکار و موضوعات کی طے شدہ بندشیں حیدرقریشی کا مسئلہ نہیں بنتیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جذبوں کے رنگ خالص ہیں اور ان کا شعری اظہار معصوم اور سادہ ہے ٹھوس موضوعات کی جگہ ایک متحرک صورت حال ہے۔اس حوالے سے حیدرقریشی کے شعری سفر کے ارتقا کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ’’ **سلگتے خواب** ‘‘ اپنے نام کی نسبت سے ہی ایک ایسے خواب کی کہانی ہے جو زندگی کی حقیقت سے وجود پاتا ہے۔یہ وہ سلگتے خواب ہیں جن میں مایوسی ،غم ، بے چینی ، اضطراب ، دُکھ ،مصیبت ، تنہائی ،موت، انفرادیت ،فردیت ، داخلیت ،موضوعیت ،عرفانِ ذات ،عرفانِ حقیقت شامل ہیں۔اس مجموعہ کا پہلا اور آخری شعر ملاحظہ ہو:

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں

جب آنکھیں مندگئیں حیدر گھنے اندھیرے میں
تو روشنی کا کوئی خواب ہی جگانا تھا

اس شعری سفر کا آغاز درد بھری رات سے ہوتا ہوا اُمید کی روشنی پر ختم ہوتا ہے۔یہ رات بہت سی تلخ یادوں کو اپنے

دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔لیکن شاعر نے اُمید کی ہلکی سے روشنی تھام رکھی ہے، تا کہ قاری اس اندھیری رات کے خوف سے گھبرا کر راستہ نہ بدل لے۔ بلکہ شاعر کے ساتھ وہ بھی اس خواب کا حصہ بنا رہے۔اُمید اور نا اُمیدی کی کشمکش کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جاگے ہیں میرے ذہن میں جب بھی تیرے خیال
خوابوں کے شہر بنتے رہے ، ٹوٹتے رہے

نہیں ہے کوئی بھی اُمید جس کے آنے کی
دل اس کے آنے کے سو سو قیاس رکھتا ہے

مرجھا چکے ہیں پھول تیری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

اُداسیوں سے بھرے دل بھی مسکرائیں گے
نئی رُتوں کے وہ دن بھی ضرور آئیں گے

حیدرقریشی کے پہلے اور دوسرے شعری مجموعوں کے درمیان میں پانچ سال کا وقفہ حائل ہے۔**''سلگتے خواب''** میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عہد گزر گیا اور اب محض اس کی دل دُکھانے والی یاد باقی ہے۔اس لیے یہاں اُمید اور رجائیت کے رنگ نمایاں ہیں۔دوسرا اور تیسرا شعری مجموعہ **''عمرِ گریزاں''** اور **''دعائے دل''** میں بھی یہی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ یہ دونوں مجموعے اپنے اختصار کے اعتبار سے ملتے جلتے مجموعے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ **''عمرِ گریزاں''** ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جس میں حیدرقریشی کا ذہنی اور تخلیقی ارتقا زیادہ وسیع طور پر سامنے آتا ہے۔اور شاعر کائنات کی وسعتوں سے اپنا ایک رشتہ بناتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس مجموعے میں شہر بدری کا دُکھ، اس وقت کے سیاسی حالات، زندگی کی تلخ سچائیوں کی تصویریں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔اور

زندگی کی اصل کی کھوج کا فلسفیانہ انداز بھی ظاہر ہوتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے شاعر زندگی سے براہِ راست مخاطب ہے۔ یوں سلگتے خواب سے شاعری کی ابتدا کرنے والے حیدرقریشی دعائے دل تک آتے آتے یہ کہنے لگتے ہیں:

سلگتے تھے کبھی چپ چاپ خود میں
مگر اب جگمگانا آگیا ہے

مہک جو دے اُٹھے اس عمر میں بھی
ہمیں وہ گل کھلانا آگیا ہے

مجموعہ کلام **''دعائے دل''** کے نام سے ہی دعا کی طاقت پرشاعر کا ایمان واضح ہوتا ہے۔ یہاں ان کے تخلیقی ارتقا کا دائرہ بھی مکمل ہوتا نظر آتا ہے۔قوم کی بے حسی سے بیزاری کا عالم ویسا ہی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ پورے نظام زندگی کو درہم برہم کر دینے والے منفی معاشرتی رویے اب براہ راست طنز کا نشانہ بنتے ہیں۔مثال۔

آج تو کھل کے ہنس دیئے حیدر
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے ہیں

لہجے کی وہ مٹھاس بھی کیا جانے کیا ہوئی
اندر کا زہر آگیا اُن کی زبان پر

خدایا اِن پہ بھی اتنی عنایتیں کر دے
کہ حاسدوں کے دلوں میں کہیں حسد نہ رہے

صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھ کیسے اس پہ میری بےزبانی پڑ گئی

حیدر قریشی کی غزلوں کے آخری پڑاؤ میں کائناتی مطالعہ کی طرف توجہ کا ایک رجحان ابھرتا ہے۔خدائے بزرگ و برتر نظامِ کائنات میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔جن حقیقتوں کو پانے کے خواب دیکھے گئے تھے اب ان خوابوں کے پورا ہونے کا گمان ملتا ہے۔عرفانِ ذات کی تلاش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

وہ بھید، وہ اسرار کھلے مجھ پہ بدن کے
دنیا میں ابھی تک جو کسی نے نہیں دیکھے

روشنی روشنی سی ہر سُو ہے
یہ تیرا دھیان ہے کہ خود تو ہے

حیدر قریشی کا شعری آہنگ الفاظ سے زیادہ احساسات کی غنائیت سے ابھرا ہے۔اس میں قدم قدم پر جذبہ کی چاشنی ہے اور تفکر کی گہرائی ہے۔انہوں نے ہر غم اور مسرت کو ایک جیسی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔اس احساس کی ترجمانی کے لیے انہیں الفاظ کی تلاش کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی بلکہ مضامین اپنے ساتھ مناسب الفاظ لاتے رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنے تجربات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھالنا جانتے ہیں۔جس طرح زندگی مجموعہ اضداد ہے لیکن پھر بھی پر کشش نظر آتی ہے اسی طرح غزل میں متضاد مضامین اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔موضوعاتی سطح پر حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہم پاتے ہیں کہ تمام مجموعوں میں یہ رنگ یکساں ہیں۔

جلاوطنی ایک ایسا موضوع ہے جسے اردو ادب کے ہر اس ادیب و شاعر نے ضرور اپنایا جو ذاتی طور پر اس سے آشنا رہا۔درد کی کوئی صورت نہیں ہوتی ہر انسان کا درد اپنے آپ میں پوری شدت لیے ہوتا ہے۔حیدر قریشی کی

شاعری کا موضوعاتی تجزیہ کرنے پر ہمیں ہجرت کا درد بھی نظر آیا۔۱۹۹۲ میں پاکستان سے جرمنی جا کر آباد ہوئے۔لیکن ملک سے دور رہنے کا درد ان کی شاعری میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔مثال۔

ایک لمحے میں کئی برسوں کے ناطے توڑ کر
سوچتے ہیں،اپنے ہاتھوں سے یہ کیا کر آئے ہیں

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اُٹھا کر آئے ہیں

رزق کی تنگی،عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے
آؤ ایسے شہر سے حیدرؔ شہر بدر ہو جائیں

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے یہ شہربدر آئے تھے

کعبہ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدرؔ
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

شہر اک اور وہاں آپ ہی بس جاتا ہے
جس جگہ جا کے ترے شہربدر رہتے ہیں

درختوں پر پرندے لوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہوگیا ہے

بیسویں صدی کے نہایت اہم فلسفے یعنی 'فلسفہ وجودیت' نے دنیا بھر کے سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کو متاثر کیا اور فرد کی آگہی، آزادی اور انفرادیت کے حوالے سے بڑے مدلل مباحث کا آغاز ہوا۔ یہ صدی ہی چونکہ خود آگہی اور خود شناسی کی صدی تھی اس لیے انسان عالمی جنگوں، مقامی خانہ جنگیوں اور جغرافیائی حد بندیوں کے ستم اٹھاتا ہوا انکشاف ذات کے مرحلے طے کرتا ہے۔ حیدر قریشی کی غزلوں میں اس کی مثال ملاحظہ ہو۔

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے بچھڑ گیا
پھر عُمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے

اس طرح شہرِ اَنا پر میں تباہی مانگوں
اپنے ''ہونے'' سے ''نہ ہونے'' کی گواہی مانگوں

میں اپنے ہونے کے احساس سے ہراساں ہوں
مِرے شعور میں کچھ کیفِ بے خودی بھر دو

اپنے اندر اتر رہا ہوں میں
اپنی پہچان کر رہا ہوں میں

جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے

اپنی ذات کے دروازے تک آپہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں

بن جاتا تریاق اسی کا زہر ،اگر تم حیدر
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

شاعری میں وحدت الوجودی رجحانات غزل کا خاص موضوع رہے ہیں۔وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ'' وجود'' صرف واحد ہے۔چشم ظاہری سے جونظر آتا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں،کائنات میں سب اسی وجودِ واحد کا جلوہ ہے ۔ وحدت الوجود کے اس نظریہ نے صوفیا پر گہرا اثر ڈالا،صوفیا کے علاوہ عربی ، فارسی اور اردو کے نامور متصوفین شعراء نے اس ہمہ گیر خیال کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔حیدرقریشی کی شاعری میں اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارہ کر لیا

جس قدر ہوتا گیا اُس کے محبت کا اسیر
ذات کے زندان سے حیدرؔ رِہا ہوتا گیا

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے

نمازِ عشق تو پروانہ وار ہوتی ہے
پھر اس میں سجدہ ، رکوع و قیام کا مطلب

جو جتنا رب کے شکر سے لبریز ہو گیا
اللہ نے کر دیا اسے کچھ اور ارجمند

صوفیانہ شاعری کا ایک موضوع موت بھی رہا ہے۔ سماجی ناہمواری اور تفرقہ پردازیوں کی تسخیر کا دوسرا اہم وسیلہ موت کا تصور فراہم کرتا ہے۔ جو ایک طرف تو دنیا کی بے ثباتی کا دکھ دل سے مٹا دیتی ہے کہ کسی چیز کو بھی ثبات و قرار نہیں ہے زندگی اور موت کا اصل تصور سمجھ آ جاتا ہے۔ حیدر قریشی کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

چار قدموں کا ہے زندگی کا سفر
دو قدم چل چکے ، دو قدم رہ گئے

موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لئے اور
یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اَڑی ہے

کوئی آوارہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی
موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی

اور تھے حیدر جو اس کی چاہ میں مَرتے رہے
ہم نت اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

چلو پھر آنکھیں کرو چار موت سے حیدؔر
پھر آج موت کی آنکھوں میں زندگی بھر دو

عشق کا تصور مختلف شعراء کے ہاں مختلف انداز میں ملتا ہے۔ میر درد کے ہاں عشق فنا تک لے جانے کا وسیلہ ہے۔ دنیا کے عیش و نشاط اور رنج و الم سے بے نیازی پیدا کرتا ہے۔ حیدر قریشی کی غزلوں کے وہ اشعار جن میں رومانوی رنگ کی چھلک ملتی ہے۔ مثال۔

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

جب تلک دیکھوں اک گلاب ہے وہ
اور چھونے لگوں تو خوشبو ہے

کچھ ایسے آتے رہے اُس کے لمس کے جھونکے
دھنک اترتی گئی دل کے ذرے ذرے میں

میری نیندیں بھی مہکانے لگے ہو
کہ خوابوں میں بھی در آنے لگے ہو

رُت بدل جائے گی اُس کے جگمگاتے جسم کی
میری رگ رگ میں مگر اک ذائقہ رہ جائے گا

حیدر قریشی کی شاعری میں سیاسی موضوعات کی مثال۔

مشینوں کے اس عہد ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

شریک تھی یہ چمن کی ہوا بھی سازش میں
اِسی لئے تو یہاں نفرتوں کے خار اُگے

پہلے آدھا ملک ہمارا توڑ دیا
باقی کو دہشت گردی سے جوڑ دیا

کس کے ''جہاد'' نے امریکہ کو طاقت دی
اور دنیا کو یہ ''تاریخی'' موڑ دیا

وہ پاک باز ہم مسلط کیے گئے
حیدرؔ دیارِ پاک کی مٹی ہوئی پلید

انسان کی عظمت بھی اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔اس تصور میں تصوف نے بھی رنگ آمیزی کی۔انسان زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اس لیے صفاتِ خداوندی کا عکس اور مظہر ہے۔صوفیا کی رائے میں انسان اپنی کمزوریوں اورکوتاہیوں کے باوجود اپنی خدا داد صلاحیتوں اور قدرتِ تسخیر کی بدولت کائنات کی دیگر تمام مخلوقات سے افضل و اعلیٰ ہے۔حیدر قریشی لکھتے ہیں:

جن و ملک سب سے اُکتا کر رب نے بنایا ،آخر
سانسوں کی چابی سے چلنے والا ایک کھلونا

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

حیدر قریشی کی شاعری میں فکر کے سوتے ان کے ذاتی مشاہدے اور فکر سے پھوٹتے ہیں۔ان کی شاعری جن تجربات پر اپنی اساس اٹھاتی ہے وہ زندگی کے قریب ترین ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنے اردگرد ماحول سے اپنے لئے موضوع تلاش کرتے ہیں ۔حیدر قریشی کے ہاں حسنِ فطرت میں پوشیدہ مفاہیم اور رموز کو سمجھنے اور کھوجنے کی بھر پور کوشش نظر آتی ہے۔حیدر قریشی نے روشنی ،خواب ، فاصلے قربتیں، آئینہ،مرجھائے ہوئے پھول،یاد،سمندر،صحرا، رنگ خوشبو وغیرہ کا بغور مشاہدہ کیا۔اور اپنے کرب کا عکس ڈھونڈتے ہوئے زندگی اور کائنات کے خفیہ مفاہیم کو سمجھنے کی کاوش میں مشغول نظر آئے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کب تلک چھائی رہے گی یوں ہی اندھی روشنی
کب تلک حیدرؔ رہیں گے اِن اندھیروں کے عذاب

اپنے جلتے ہوئے خوابوں میں اُتر کر حیدرؔ
اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا ہو جاؤ

میں روشنی ہوں تو اُترا ہوں روح تک اُس کی
وہ آئنہ ہے تو پھر مجھ پہ منعطف ہو جائے

سانپ بن کر ڈس گئیں اک دن لکیریں ہاتھ کی
قسمتوں میں رہ گئے اب صرف یادوں کے عذاب

صحراؤں کے دامن میں سمندر نہیں رکھا
اب آنکھوں میں ایسا کوئی منظر نہیں رکھا

سمندروں کی جگہ دشتِ بے کنار دیا
الٰہی ! کشتی جان کو کہاں اتار دیا

ملا تھا گر چہ بچھڑنے کے واسطے حیدرؔ
وہ قربتوں کی مہک فاصلوں میں چھوڑ گیا

سیراب کرکے ، پیاس کی لذّت کو چھین کر
صحرا کے ضابطے ، ادب آداب لے گیا

رنگ و خوشبو کا کوئی جادو اُسی کے دم سے ہے
گلشنِ ہستی میں جو چٹکی ہوئی ہے زندگی

بلاشبہ حیدر قریشی کی شعری کائنات جدید شعری ادب میں گراں قدر اضافہ ہے جو ہمیں اپنی طلسم اور بھید بھری فضا سے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

**نظم:**

حیدر قریشی کی نظم ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہے جسے نہ تو ہم اپنے عہد کی نظم سے انحراف کی صورت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی لسانی وفکری سانچے توڑتی ہوئی بغاوت قرار دے سکتے ہیں بلکہ اس نظم میں معاصر لہجے کا تمام جو ہر کشید ہوتا نظر آتا ہے لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس پر اثر پزیری کی چھاپ نظر نہیں آتی۔حیدر قریشی کی شاعری داخل وخارج اور ذات وکائنات کے سہہ رنگ احساسات وتاثرات کا خوبصورت امتزاج ہے۔حیدر قریشی ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے سیاحتِ قلب کو خارجی حقائق کی عکاسی پر ترجیح دی اور احساسات کے اَن دیکھے سمندروں میں غوطہ زن ہیں۔مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنے اردگرد پھیلی کائنات اور حقیقی زندگی کی تلخیوں کو نظر انداز کیا ہے۔بلکہ وہ خارج کے تیل سے داخل کے چراغ روشن کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی تخلیقی جَست ہمیشہ اندر سے باہر کی طرف ہوتی ہے۔

حیدر قریشی کی شاعری کا رنگ غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔حیدر قریشی کی نظموں کا سفر ۱۹۹۶ء میں شروع ہوتا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ **''عمر گریزاں''** ہے جس میں غزلوں اور ماہیوں کے ساتھ کل ۲۵ نظمیں شامل ہیں۔شعری مجموعہ **'' دعائے دل ''** میں ۲ نظمیں (نئی شالاط، دعا) اور مجموعہ **''درد سمندر ''** میں ۳ نظمیں (چلو اک نظم لکھتے ہیں، محبت کا ایک یادگار دن، مبارک باد اور پُرسہ) شامل ہیں۔ان تینوں مجموعوں کے بعد کی ۳ نظمیں (بوند بھر روشنی، جوابِ آں نظم، اجنتا کے غار کی ایک تصویر) ہیں،۔حیدر قریشی نے اپنی نظموں میں انسان کی باطنی بے چینیوں، بے قراریوں، تمناؤں، خواہشوں کے علاوہ غم کے پہلوؤں کو پورے جذباتی خلوص اور فنی حسن کے ساتھ بیان کیا ہے۔مثالیں ملاحظہ ہو۔

اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا، جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے
چپ کھڑی ہے میری تنہائی،

اور اس کے گرد
اک سفّاک سناٹا
مسلسل رقص کرتا ہے!                (خلا)

گہرے سناٹے میں
دُور سے
کالے انجن کی سیٹی کی آواز آتی ہوئی
دل کو بھاتی ہوئی
اک لرزتی، سسکتی صدا                (درد)

یہ کیسی دُھند سی پھیلی ہے
میرے چار سُو
کچھ بھی نظر آتا نہیں
چاروں طرف مہکے ہوئے، پھیلے ہوئے
شادابیوں، زرخیزیوں کے
کتنے ہی منظر ہیں
لیکن دُھند نے سارے مناظر
اپنے دامن میں کچھ اِس ڈَھب سے چھپائے ہیں                (ایک اداس کہانی)

تصور کے اُجلے دریچے سے میں نے
غمِ زندگی کا جو پردہ ہٹایا

تو یادوں کی سرسبز وادی میں
بیتے دنوں کی ہزاروں حسین اور رنگین گھڑیاں
محبت کے پھولوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں
**(میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا)**

ہر اک خواہش دعا کے روپ میں
ڈھلنے سے خائف ہے
مگر مولا!
مجھے تجھ سے نہ کوئی بدگمانی ہے
نہ کوئی بے یقینی ہے
**(دعا گزیدہ)**

شاعر کو عموماً اپنی خارجی زندگی سے بھی گہری دلچسپی ہوتی ہے اور یہی دلچسپی اسے کائنات اور اپنی ذات میں مفاہمت کا وسیلہ معلوم ہوتی ہے اور کبھی فرد اور کائنات کے تضادات کو سامنے لاتی ہے۔ مظاہر فطرت ذات اور کائنات کی اسی آویزش و آمیزش کے رشتے کو ایک معنویت بخشتے ہیں کبھی مونس وغم خوار بن کر اور کبھی مدّ مقابل آ کر لیکن ہر دو صورتوں میں فرد اپنا رشتہ اپنے گردوپیش سے زیادہ شدت سے استوار کرنا چاہتا ہے۔ حیدر قریشی کی نظموں میں حسنِ فطرت سے ایک خاص لگاؤ نظر آتا ہے۔ حیدر قریشی فطرت کے حسن کو موضوع بناتے ہیں تو ایک سحر پیدا کر دیتے ہیں۔ حیدر قریشی کی وہ چند نظمیں جن میں فطرت کا حسن ایک مسحور کن کیفیت پیدا کرتا ہے ان میں 'پھاگن کی سفاک ہوا''، ''بہار کے پہلے دن''، ''ہوا''، ''صدا کا سمندر''، ''سرسوں کا کھیت'' اہم ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی نظم ''پھاگن کی سفاک ہوا'' عمر گریزاں میں شامل نظم ہے۔ اس نظم میں سفاک ہوا ایک عمومی تاثر کے برعکس اپنے اندر معنوی کشش بھی رکھتی ہے۔ جس کا باعث یہ بھی ہے کہ شاعر صرف منظر کے خارجی حسن سے متاثر نہیں بلکہ وہ اس صورت حال میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ان کھوئے ہوئے لمحوں کو جی رہا ہے جو دنیا کی بھاگ دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔

اگر اس وقت پھاگن کی ہوا سفّاک نہ ہوتی
تو میں اس بند کمرے میں
حَسیں بچپن کے ایسے جگمگاتے
اور سہانے دن کہاں پاتا
جہاں گردی کے چکر میں
ہمیشہ کی طرح کھویا ہوا ہوتا
یہ پھاگن کی ہوا سفاک بھی ہے مہرباں بھی ہے!

اس طرح نظم ''صدا کا سمندر'' دیکھیئے۔
فضا میں سمندر کی لہروں سی آواز ہے
سمندر کے ساحل سے اس وقت میں
سینکڑوں میل کے فاصلے پہ ہوں، پھر
یہ فضا میں سمندر کی لہروں کی موسیقی
کیوں نشر ہوتی چلی جا رہی ہے
انوکھی صدائیں امنڈتی چلی آ رہی ہیں
مِری رُوح پر چھا رہی ہیں
دسمبر کی یخ بستہ صبحوں میں
سورج نکلنے سے پہلے، فضا میں
پہاڑوں کے کوّوں کی ڈاریں اڑی جا رہی ہیں
انہیں کی صدائیں

سمندر کی لہروں کی میٹھی،

سریلی صداؤں میں ڈھل کے

پہاڑوں کے دامن میں

الہام بن کر اترتی چلی جا رہی ہیں

اور میں اس فضا میں، صدا کے سمندر میں

پرواز کرتا ہوا تیرتا جا رہا ہوں! **(صدا کا سمندر)**

اس نظم میں منظر فطری طور پر تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ اور شاعر کا تکلّم انہی تبدیل ہوتے ہوئے مناظر کے سہارے فطرت کے حسن کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ''مِری روح پر چھا رہی ہے'' کے مصرع تک آتے آتے نظم اپنی تخلیق کا دائرہ مکمل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

''ہوا'' حیدر قریشی کی ایسی نظم ہے جس میں ہوا کی حکمرانی اور تسلط کے ساتھ مصنف نے ہوا کی طاقت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ہوا

یہ شُوکتی، پھنکارتی ناگن ہوا

برہم ہوئی

بل کھا کے جب پلٹی

تو آنچل سر سے ڈھلکا

زہر اس کا

کانچ کی ان چوڑیوں تک بھی

اتر آیا، جو پہنی ہی نہ تھیں

ہوا، یہاں تغیر کے باوجود فطرت کے ازلی تسلسل کو سامنے لاتی ہے۔ نظم کا اختتام دیکھیئے۔

زمیں، پانی، فضاؤں تک
جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہو اگر تو زندگی معدوم ہو جائے
نہ پھر یہ دل کے دریا ہوں کہ جن میں
روٹھنے والے
مسافت کو ادھورا چھوڑ کر
خود آن بستے ہیں
جہاں ان کی حسیں یادوں کے سب منظر مہکتے ہیں
ہوا ناگن سہی، ڈائن سہی، لیکن
ہوا تو زندگی بھی ہے! **(ہوا)**

اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت کے تسلسل اور زندگی کے تغیر و تبدل میں ایک گہرا ربط ہے کہ انسانی زندگی اپنے تمام تر حسن اور کمالات کے باوجود فطرت کے غیر فانی دھارے پر سبقت نہیں پا سکتی اور اسی کا بیان حیدر قریشی نے ہوا کے ذریعے کیا ہے۔

نظم ''سرسوں کا کھیت'' میں سرسوں کے پھول کو نئے انداز سے دیکھا گیا ہے۔سرسوں کے پودوں پہ پیلے پھولوں کا آجانا دُکھ کی نشانی بتائی ہے۔مصنف اپنی نگاہ سے اس غم وخوشی کو محسوس کروانا چاہتا ہے۔

یہ بے انت میدان
سرسوں کے سرسبز پودوں سے،
پودوں پہ پھولوں سے
غم اور خوشی سے اَٹا ہے
مرے دل کے نزدیک آؤ تو دیکھو یہ میدان کیا ہے! **(سرسوں کا کھیت)**

تخلیق کا آغاز تو اُسی وقت ہوتا ہے جب انسان کائنات کو دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی معرفت حاصل کرتا ہے۔بغیر اس معرفت کے لفظ مُردہ ہی نظر آتے ہیں۔ دراصل کائنات کی ہر چیز میں معنویت کا احساس ملتا ہے۔شاعر اس معنویت میں غوطہ زن ہے، جہاں سے وہ جواہر نکال کر قاری کے سامنے بکھیرتا ہے۔نظم ''حاصل زندگی'' میں شاعر نے زندگی کی عکاسی کی ہے۔جو کہ پانی کی مثال ہے، جہاں پوری روانی ہے۔یہاں پوری نظم کی قرات ضروری ہو جاتی ہے۔

میری آنکھیں بھی کب میری آنکھیں ہوئیں
ندیوں کی طرح اس کا پانی کبھی
پتھروں سے الجھتا ہوا، سر پٹختا ہوا
اور کبھی جیسے خاموش سی جھیل ہو
پھر کبھی ان میں دریاؤں جیسا سکوں
اور کبھی چودھویں رات میں
جیسے کوئی سمندر رہمکتا ہوا
میری آنکھوں کے اِن پانیوں سے
نکل کر کوئی جل پری
کوئی ننھی سی، پیاری سی گڑیا
مِری سمت آئی
تو میں اپنی ننھی ہتھیلی پہ اُس کو اُٹھائے ہوئے
دوسرے ہاتھ سے اُس کو تھامے ہوئے
یونہی تکتا رہا
اس کے چہرے پہ معصومیت کی چمک
اور شرارت سے مہکا ہوا نوُر تھا
میں اُسے دیکھتے دیکھتے کھو گیا

(آج تک خود سے کھویا ہوا ہی تو ہوں)

اور پھر جانے کب

وہ مری آنکھ کے پانیوں میں کہیں چھپ گئی

تب میں اپنے کنارے پہ ہی،

اپنے جنگل میں ہی

جوگ لے کے یوں بیٹھا

کہ ہر پل میں صدیاں گزرتی گئیں

کتنی صدیوں کے بعد ایک دن

پھر مری آنکھ کے پانیوں سے اچھلتی ہوئی

اور چھینٹے اڑاتی ہوئی وہ مرے پاس آئی

اس کے چہرے پہ معصومیت اور شرارت کا نور

اور بھی بڑھ گیا تھا، مگر میرا دل تو بجھا تھا

میں گہرے دکھوں اور اداسی کے سایوں میں

جوگی بنا یونہی بیٹھا رہا

تب بالآخر اُسی نے مجھے گدگداتے ہوئے

اپنے ننھے سے ہاتھوں سے تھاما تو ایسے لگا

میں جو صدیوں سے کھویا ہوا تھا

میں خود کو پھر مل گیا ہوں

یہی خواب

بس اک یہی خواب ہے حاصلِ زندگی!

(حاصلِ زندگی)

حیدرقریشی کی نظموں کا فکری اور فنی شعور اس بات کا غماز ہے کہ وہ ایک بڑے تخلیق کار ہیں۔ان کی نظموں کا ہیئتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے آزاد نظم میں زورِقلم آزمایا۔ان کی نظموں میں کوئی رُکاوٹ یا جمودی کیفیت نظر نہیں آتی ،کہ قاری کسی قسم کا جھٹکا محسوس کرے، بلکہ سرگوشی کی کیفیت سے اپنے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے۔

**ماہیا:**

لوک ادب قوم کا وہ سرمایا ہے جس میں معاشرے کے رہن سہن،تہذیب وتمدن اور ثقافت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ظلم وتشدد کے کھٹن بھرے ماحول سے نجات پانے کے لیے لوگوں نے گیت کا سہارا لیا۔ یہ گیت اُس دھرتی کی سوغات ہوتے ہیں۔ یہ گیت ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی تک پہنچ کر مقبول ہوئے۔پنجاب کے سوہنے لوک گیتوں میں سے ایک گیت''ماہیا'' ہے۔ماہیا لوک روایت سے جڑی شعری صنف ہے۔ یہ علمی سطح پر لکھی اور پڑھی جانے والی صنف ہے۔ماہیا''ماہی'' سے بنا ہے۔ماہی سے مراد''محبوب'' ہے۔ماہیا دراصل تین مصرعوں والی وہ نظم ہے جس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن ہوتا ہے۔جبکہ درمیانی مصرعہ، پہلے اور آخری مصرعوں سے دوحرف کم ہوتا ہے۔

اردوادب نے دوسری زبانوں کی طرح پنجابی زبان کا اثر بھی قبول کیا۔اس صنف ماہیا کو اردو میں لکھ کر نئے تجربہ کیے گئے۔سب سے پہلے اردو ماہیے کی ابتدا فلموں اور ریڈیو سے ہوئی۔ ماہیا گائی جانے والی صنف پہلے ہے اور لکھی جانے والی بعد میں۔ پہلے پہل اس کیلئے بحر اور وزن کی جگہ دھن، ردم اور آوازوں کا تعین کیا گیا تھا۔حیدرقریشی کی ادبی جہت کا ایک رنگ ماہیا نگاری بھی ہے۔انہوں نے کل ۲۸ عنوان کے تحت ماہیا کہے۔اردو ادب میں اِس لوک روایت کو ادبی شکل دینے میں حیدرقریشی کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے پنجابی، اردو اور فلمی نغموں کے طور پر لکھے جانے ماہیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ماہیے کی خصوصیت کا بیان کرتے ہوئے حیدرقریشی کہتے ہیں۔

> یہ تخلیق کار کو خلا سے اتار کر زمین پر لاتا ہے۔ماہیے میں زندگی اور دھرتی سے گہری وابستگی ہے۔پھر اس میں ژولیدہ ابہام گوئی کی کوئی گنجائش نہیں۔آگے وہ کہتے ہیں کہ ان دوخصوصیت کی بنا پر ماہیا ایسے وقت پر مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ

لیا تھا۔ادب دھرتی سے کٹ کر خلا میں معلق سا ہو گیا تھا۔ایسے حالات میں ماہیے نے نہ صرف اپنی دھرتی کی اہمیت کا احساس دلایا بلکہ بامعنی تخلیق کے لیے لفظ و معنی کے ہم رشتہ ہونے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔(۱۸)

**''محبت کے پھول''** حیدر قریشی کے ماہیوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔جسے ۱۹۹۶ء میں نایاب پبلی کیشنز، خان پور نے شائع کیا۔اس کے علاوہ شعری مجموعہ **'' درد سمندر ''** میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ کچھ ماہیے بھی شامل ہیں۔۱۹۹۰ سے ۲۰۰۰ ء تک تقریباً دس سال حیدر قریشی نے ماہیے کی ہیئت اور وزن کے بارے میں مختلف رسائل میں خطوط اور مضامین کا سلسلہ جاری رکھا۔اردو ماہیے سے متعلق ان کا موقوف مختصراً یہ ہے۔

۱۔ ماہیے کے تین مصرعے ہوتے ہیں۔

۲۔ ماہیے کے تین مصرعوں میں سے پہلا اور تیسرا مصرعہ وزن کے اعتبار سے برابر'' مفعول مفاعلین'' کے وزن پر ہوتا ہے۔جبکہ دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہو جاتا ہے۔یعنی ''فعل مفاعیلن''۔

۳۔ یا حیدر قریشی کے مطابق ماہیے کا وزن

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

حیدر قریشی کا خیال ہے کہ جن شعراء کے ماہیے تین برابر وزن کے مصروں پر مشتمل ہیں۔وہ درست ماہیے نہیں۔نیز یہ کہ جو شعراء تین برابر مصرعے میں ماہیے کہتے ہیں، وہ ایسا سہل پسندی کی وجہ سے کرتے ہیں۔درمیان والے مصرعے میں ایک سبب سے کم کرنا ان کے لیے ایک مشکل مرحلہ ہے۔انور سدید لکھتے ہیں۔'' یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بعض شعراء نے محض لاعلمی میں ماہیا کے تین مصرعوں کو ہم وزن کر دیا تو جناب حیدر قریشی نے اس '' بے شعوری'' غلطی کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اس غلطی کے استیصال کیلئے تحریک بھی جاری کر دی۔۔۔۔کوششیں رنگ لا رہی ہیں اور اب ماہیا اوزان کی صحیح تکنیک میں لکھا جا رہا ہے۔'' (۱۹)

---

۱۸۔ سعید شباب، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴، ص، ۳۰۔۳۱۔

۱۹۔ ''اردو ماہیا اور حیدر قریشی''، ادب ساز، (دہلی)، شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۸ ص، ۱۵۔

ہر دور میں علمی یا فنی سطح پر نئے تجربات کے حوالے سے تخلیقی عمل کو بحث و دلائل کی روشنی میں درست یا نادرست قرار دیا جاتا ہے۔ حیدر قریشی نے بھی ماہیے سے متعلق ایک پوری تحریک چلائی۔ ماہیا کی ہیئت کی پہچان کرائی۔ حیدر قریشی نے جہاں اوزان متعین کئے وہیں ماہیے کے مزاج کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

جہاں تک ماہیے کے مزاج کے مسئلے کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں وزن کی طرح کوئی حتمی و دوٹوک بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ وزن کو ماہیے کا جسم سمجھ لیں تو مزاج اس کی روح ہے۔۔۔۔۔۔ حمدیہ، نعتیہ ماہیے، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج والے ماہیے بھی پنجابی ماہیے کے اس عمومی مزاج سے بالکل مختلف ہیں۔ جو عام طور پر پنجابی ماہیے کی شناخت ہے۔ جس طرح ماہیے کے مزاج کا زیادہ تر انحصار قاری یا سامع کے ذوق اور مزاج پر ہے ویسے ہی ماہیا نگار کا ذاتی ذوق اور مزاج بھی اس کے ماہیوں میں فطری طور پر آئے گا۔ کوئی نظم نگار شاعر ماہیا کہے گا تو ان میں نظم کے اثرات آئیں گے کوئی غزل گو شاعر جب ماہیے کہے گا تو اس کے ماہیے میں غزل کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ضرور آئیں گے اسی طرح اردو کا گیت نگار اگر ماہیے کہے گا تو گیت کی ہندی روایت بھی اپنا اثر دکھائے گی۔ نظم، غزل اور گیت کے اثرات اردو ماہیے کے تشخص کو ختم نہیں کریں گے بلکہ اسے تازہ خون فراہم کریں گے۔ ان اثرات سے ماہیے کا مزاج مزید بہتر ہوگا۔ (۲۰)

حیدر قریشی کے ماہیوں کے موضوعات (سیاسی، سماجی، معاشرتی، عشقیہ، فلسفیانہ، اصلاحی، مذہبی) تقریباً وہی ہیں جو انہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں برتے ہیں۔ زمین سے وابستگی کا احساس یہاں بھی موجود ہے۔ چونکہ ماہیا لوک روایت سے وابستہ ہے یہی وجہ ہے کہ حیدر قریشی کے ماہیوں میں اپنی تہذیب و تمدن کا رنگ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ پنجاب کی سر زمین کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مکھ دھرتی کا نوُرانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اِس کی ہیں پیشانی

چشمے کہساروں کے
فیض یہ دھرتی ماں
کے دُودھ کی دھاروں کے

حیدر قریشی کے ماہیوں پر ان کے مزاج کا عکس مکمل طور پر نظر آتا ہے۔ چونکہ ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف بھی رہا

۲۰۔ ''اردو ماہیا اور حیدر قریشی''، ادب ساز، (دہلی)، شمارہ: جنوری تا جون، ۲۰۰۸، ص ۱۶۔

ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کہے ماہیوں پر روحانیت کے اثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔حمدیہ اور نعتیہ قسم کے ماہیوں کی مثال۔

تو خُد میں اکیلا ہے — تُو خالقِ اعلیٰ ہے
تیرے دم سے مگر — ’’جو ہر نام سے اور
سنسار کا میلہ ہے — ہرروپ سے بالا ہے‘‘

وہ شخص ہی جاہل ہے
جو توحیدِ خدا
کے بارے میں سائل ہے

سلگتے خواب یہاں بھی موجود ہیں۔دراصل یہ خواب حیدرقریشی کی زندگی کے وہ واقعات ہے جن میں دُکھ کا رنگ صاف نظرآتا ہے۔مثال۔

کیسی تحریریں ہیں — چلنے کو ترستے ہیں
دشمن اپنے ہی — منزل گم ہے کہیں
ہاتھوں کی لکیریں ہیں — بکھرے ہوئے رستے ہیں

ہر بات انجانی ہے
پر یہ تمہارا دُکھ
میری ہی کہانی ہے

ماہیا دراصل احساس ہے محبت کا۔عشق حقیقی،عشق مجازی،اپنی جڑوں سے لگاؤ،ماضی سے جڑے رہنا۔ان تمام باتوں کی اصل وجہ احساسِ عشق ہی ہے۔حیدرقریشی کے ماہیوں میں رومانوی رنگ کی مثال ملاحظہ ہو۔

ہونٹ اس کے اناری ہیں — ان آنکھوں کی مغروری
گال ہیں اس کے یا — ہوش اُڑا ڈالے
دو سیب قندھاری ہیں — وہ شربتِ انگوری

اظہار ضروری ہے
پیار اگر ہو تو
اقرار ضروری ہے

حیدرقریشی ماضی کی یادوں سے کبھی الگ نہیں ہوتے ۔ان کا ماضی ان کے آج میں ہمیشہ شامل ہو کر مستقبل سے باخبر رکھتا ہے۔

ماضی کی دشاؤں سے
کون بلاتا ہے
یادوں کی گپھاؤں سے

حیدرقریشی کے نزدیک رشتوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ اس احساس سے اپنی تحریروں کو بچا نہ سکے۔اپنی تمام تر تحریروں (افسانہ، خاکہ، انشائیہ، یادیں، غزل، نظم ) میں انہوں نے خاندانی افراد کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ ان کے لیے اپنے احساسات وجذبات کو بھی پیش کیا ہے۔یہی احساس ان کے ماہیے میں بھی نظر آتا ہے۔''چند رشتے'' کے عنوان سے حیدرقریشی نے اپنی ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بیٹے، بیٹی کے لئے جذباتی انداز میں ماہیے کہے۔مثال۔

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مِرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

تب آنکھ برستی ہے
دل میں کہیں چھپ کر
ماں جب مِری ہنستی ہے

اک رُوح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

دریا کی روانی ہے
اب مِرے بیٹوں میں
مِری گذری جوانی ہے

''داستانیں'' کے عنوان سے سوہنی مہیوال، رادھا کرشن، ہیر رانجھا، سیتا رام، سسی پنوں، پر افسانوی انداز میں ماہیے تحریر کیے۔مثال۔

| | |
|---|---|
| پنوں تھا کہ بادل تھا | اَن ہونے کام ہوئے |
| آنکھ میں سسّی کے | سیتا کے ہاتھوں |
| صحرا کوئی جل تھل تھا | پتھر بھی رام ہوئے |

| | |
|---|---|
| جب بیٹھی تھی ماجھے میں | پہلے پُر آب ہوئی |
| ہیر میں تھا رانجھا | یاد میں سوہنی کی |
| اور ہیر تھی رانجھے میں | پھر آنکھ چناب ہوئی |

مجموعہ **''درد سمند''** میں شامل ماہیے بچپن کی یادوں سے لے کر جرمنی تک کا سفر کرتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ اظہار خیال میں جو تبدیلی آئی اس کی مثال ماہیوں میں موجود ہے۔جرمنی کی تہذیب، رہن سہن کو سادہ بیانی سے پیش کیا ہے۔بچپن کی یادوں اور جرمنی کے حوالے سے چند ماہیے ملاحظہ ہو۔

| | |
|---|---|
| بچپن کے خزانے میں | دن تو وہی اچھے تھے |
| کتنے زمانے تھے | جب اسکول کے ہم |
| اُس ایک زمانے میں | چھوٹے سے بچے تھے |

| | |
|---|---|
| تھے دیس میں پردیسی | مولا کی عنایت تھی |
| آ کے ولایت میں | اپنے مقدر میں |
| اب ہوگئے ہیں دیسی | جرمن کی ''ولایت'' تھی |

مجموعہ ''محبت کے پھول'' میں چند ایسے ماہیئے بھی ملتے ہیں جو وزن کے اغلاط پر مشتمل ہے۔مثال کے طور پر۔

۱۔ پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں<br>
بستی میں پکّی<br>
جب بچھنے لگی سڑکیں

پہلا مصرع وزن سے خارج ہے۔ پگڈنڈیوں کی جگہ'' پگڈنڈ'' پڑھا جاتا۔ گویا مصرع یوں ہوتا۔'' پگڈنڈ کے دل دھڑکیں''۔

۲۔ بندوق دکھاتا تھا
بلبلوں چڑیوں کو
دھمکاتا ڈراتا تھا

''فاعلن'' ماہیے کا وزن نہیں ہے۔ یُوں دوسرا مصرع بے وزن معلوم ہوتا ہے۔''بلبل چڑیوں کو'' ہوتا تو مصرعہ وزن میں آجاتا۔

۳۔ نہیں ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

حیدر قریشی کے اپنے قایم کئے گئے ارکان کے مطابق پہلا مصرعہ ''نہیں ہم نہیں روئے تھے'' وزن میں نہیں ہے۔

۴۔ خشبو اناس ایسی
میٹھے سے لہجے
میں باتیں کھٹاس ایسی

یہاں'' اناس'' غلط باندھا گیا ہے۔ دوسری مصرعہ بے معنی ہے۔'' میں'' دوسرے مصرعے کے آخر میں ہونا چاہئے تھا۔ ناکہ تیسرے کے شروع میں۔ مگر پھر دوسرے مصرعے میں ایک سبب کی کمی آڑے آجاتی ہے۔

۵۔ خوشبوؤں کے تختوں سے
آتے رہے جھونکے
کنوں کے درختوں سے

پہلے مصرعے میں'' خوشبوؤں'' مصرعے کو بے وزن کر دیتا ہے۔ حرف خوشبو ہونا چاہئے تھا۔

۶۔ ہونٹ اُس کے اناری ہیں
گال ہیں اُس کے یا
دو سیب قندھاری ہیں

''قندھاری'' کا ''ن'' گر گیا ہے۔ جو وزن کی غلطی سے ہے۔ اگر ''ن'' کو قایم رکھتے ہیں تو سیب کی ''ب'' گر جاتی ہے۔

۷۔ ہر خواہش جل گئی ہے
اب کیوں آئے ہو
جب عمر ہی ڈھل گئی ہے

پہلے اور آخری مصرے کا وزن ''مفاعلین'' یا فعلن'' وہ نہیں۔

بُورِ آگیا آموں میں
رونقیں جاگ اُٹھیں
دیہات کی شاموں میں

آموں میں نہیں آموں پر بُورا آنا ہے۔

اقرار کی گھڑیاں ہیں
جگمگ کرتی ہوئی
یہ سنہرے کی لڑیاں ہیں

آخر مصرع ''یہ'' کے بغیر مکمل ہے۔

ان سب کے باوجود یہ کہنا ضروری ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی نے ماہیا کے حوالے سے جو کام کیا وہ ان کی ادبی شخصیت کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جب کبھی ماہیا کا نام اردو ادب میں لیا جائے گا حیدر قریشی کا نام آنا لازمی ہے۔

## خاکہ:

ادب کی جس صنف کے لیے انگریزی میں سکیچ یا پن پورٹریٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اردو میں اسے خاکہ کہتے ہیں۔خاکہ نگاری سُخن کی وہ صنف ہے جس میں کسی شخص کا حلیہ الفاظ کے ذریعے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کی چلتی پھرتی ہو بہو تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔بظاہر یہ فن بہت سادہ اور مختصر محسوس ہوتا ہے،لیکن اس میں شاعرانہ پیچیدگی کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے کیونکہ کم الفاظ میں شخصیت کی داخلی عادات اطوار اور کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ قاری کو محسوس ہو کہ اس نے بذات خود ملاقات کی ہے۔

خاکہ نگاری کے لیے فنکار کے پاس گہرا مشاہدہ اور نفسیاتی بصیرت ضروری ہے کیونکہ انسان بظاہر سلجھا ہوا اور سادہ نظر آتا ہے لیکن اس کا وجود شعور، لاشعور اور تحت الشعور کا مجموعہ ہے۔ایک اچھا خاکہ بنیادی طور پر کسی بھی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہوتا ہے۔جس میں لکھنے والا اپنے مشاہدات اور واقعات کی بے لاگ عکاسی کر کے منظر عام پر لاتا ہے۔اس کی اپنی ذاتی رائے تو اس پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ جس شخصیت کا خاکہ لکھا جاتا ہے اسے من و عن ہی پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔خاکہ نگاری کے لیے بنیادی ضرورت بڑے عمیق مشاہدے اور مستقل مزاجی کی ہوتی ہے کیونکہ سچائی ، صاف بیانی ،حکیمانہ نگاہ ،عیب جوئی سے پرہیز اور سراپا نگاری کا سلیقہ فن کے نکھار کے بنیادی جُز ہیں۔اختصار اور شگفتہ اسلوب پر بھی گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔

حیدر قریشی کی ہمہ جہت ادبی زندگی کا ایک پہلو خاکہ نگاری پر بھی مشتمل ہے۔اگر چہ ان کا بنیادی میدان شاعری ہے تاہم انہوں نے اپنے قریبی لوگوں کے خاکے بھی لکھے۔**''میری محبتیں''** حیدر قرشی کے خاکوں اور یادوں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں بیس خاکے شامل ہیں ۔ جسے انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ابتدائی حصّے کو انہوں نے ''اول خویش'' کا نام دیا، اور بعد کے دوسرے حصے کو'' بعد درویش'' کے نام سے منسوب کیا ہے۔کتاب کا پہلا حصہّ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسے حیدر قریشی نے اپنے اہل و اقارب کی نذر کیا ہے۔انہوں نے تمام خاکوں کو اس خوبصورتی سے نقش کیا ہے جن میں خاکہ نگاری، افسانہ نگاری، سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کا امتزاج دل نشین صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔دورانِ مطالعہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ان افراد کے بارے میں

پڑھ نہیں رہے بلکہ ان سے مل رہے ہیں۔ ''میری محبتیں'' میں حیدر قریشی نے جن عنوان کے تحت خاکے لکھے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

**(ا) اول خویش:**

۱۔ برگد کا پیڑ (ابا جی)

۲۔ مائے نی میں کنوں آکھاں (امی جی)

۳۔ ڈاچی والیا موڑ مہار وے (دادا جی)

۴۔ مظلوم متشدد (نانا جی)

۵۔ مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ (تایا جی)

۶۔ رانجھے کے ماموں (ماموں ناصر)

۷۔ محبت کی نمناک خوشبو (آپی)

۸۔ پسلی کی ٹیڑھ (مبارکہ)

۹۔ اُجلے دل والا (چھوٹا بھائی)

۱۰۔ زندگی کا تسلسل (پانچوں بچے)

**(ب) بعد درویش:**

۱۱۔ اردو ادب کے نوبل پرائز (میرزا ادیب)

۱۲۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی (فیض احمد فیض)

۱۳۔ عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)

۱۴۔ ایک ادھورا خاکہ (غلام جیلانی اصغر)

۱۵۔ بلند قامت ادیب (اکبر حمید)

۱۶۔ صاف گو ادیبہ (عذرا اصغر)

۱۷۔ دوستی کا کمبل (سعید شباب)

۱۸۔ عاجزی کا اعجاز (محمد اعجاز اکبر)

۱۹۔ میرا فیثا غورث (طاہر احمد)

۲۰۔ پرانے ادبی دوست (خان پور کے احباب)

حیدر قریشی نے عام روش سے نسبتاً ہٹ کر اپنی خاکہ نگاری میں ظاہری حلیہ کو اہمیت دینے کے بجائے فرد کے باطن میں جھانک کر اس کی باطنی کیفیت و صلاحیت کو اپنا مطمع نظر بنایا اور یہی چیز ان کے خاکوں کی خاصیت ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے افراد خاندان کے بہت دلچسپ خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں انسانی مزاج اور انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے لفظوں کی جادوگری سے قاری کو اسیر بنانے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ زبان کی سادگی، انداز کی سلاحیت، بیان کی پختگی اور روزمرہ کے واقعات کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ غیر معمولی ہو جائیں، یہ حیدر قریشی کی نثری خصوصیت ہے۔ جو ہمیں اس کے خاکوں میں بھی نظر آتی ہے۔

''میری محبتیں'' میں شامل پہلا خاکہ (برگد کا پیڑ) حیدر قریشی نے اپنے والد صاحب کا لکھا۔ برگد کا پیڑ جو کہ علامت ہے گیان کا، بزرگی کا۔ ہندو مذہب میں اس درخت کی ایک خاص اہمیت ہے۔ حیدر قریشی نے بہت سوچ سمجھ کے اس خاکے کو'' برگد کا پیڑ'' نام دیا ہے۔ ان کو اپنے والد سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ انہیں'' ابوا'' کہتے تھے۔ والد سے اپنا تعارف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> باپ بیٹے کے مابین اولیّن تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔ اپنی پیدائش سے پہلے میں ابا جی کے لہو میں رواں تھا تو ابا جی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کے باوجود شعوری سطح پر ابا جی سے میرا پہلا معانقہ اس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیُولے کی طرح موجود ہے۔ (۲۱)

حیدر قریشی کے والد بزرگ آدمی تھے۔ ان کی شخصیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ابا جی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو تر کی ٹوپی بھی کہتے ہیں۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور

..............................

۲۱۔ حیدر قریشی، میری محبتیں، دہلی: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص، ۵۔

جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔آج اباجی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ،ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ (۲۲)

مزید لکھتے ہیں۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ اباجی کے اندر موجود رہا۔یہ درویش خواب بین،دعا گو اور صاحبِ کشف وکرامت تھا۔(۲۳)

حیدرقریشی کے والد صاحب وجدان کی خصوصیت رکھتے تھے۔اپنے اس خاکے میں حیدرقریشی نے والد صاحب کے کچھ ایسے خواب کا بھی ذکر کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

اباجی ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اترے ہوئے ہیں۔وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں گے۔لیکن اباجی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔ (۲۴)

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے اباجی نے نے یکے بعد دیگر دو خواب دیکھے تھے۔پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔اباجی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔یہ خواب سن کر اباجی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔۔۔۔۔۔دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔اباجی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرمادیں۔مرشد کو اباجی کے خواب کا علم نہیں تھا۔انہوں نے مجھے حیدر بنادیا۔مگر اباجی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔شاید حسن اتفاق تھا کہ میں پیدا ہوگیا اور حیدر نام رکھا گیا۔(۲۵)

کتاب میں شامل دوسرا خاکہ (مائے نی میں کنوں آکھاں) حیدرقریشی نے اپنی والدہ کا لکھا ہے۔انہوں نے اپنی تمام تر تخلیقات میں باریک سے باریک چیزوں کا خیال رکھا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے۔چونکہ ان کی والدہ پنجابی تھیں شاید اسی وجہ سے انہوں نے اس خاکے کا عنوان پنجابی زبان میں رکھا۔خاکے کی ابتدا جس شعر سے کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

..............................

۲۲۔ حیدرقریشی، میری محبتیں، دہلی: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء،ص،۵۔
۲۳۔ ایضاً،ص،۶۔
۲۴۔ ایضاً،ص،۸۔
۲۵۔ ایضاً،ص،۹۔۱۰

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

یہ شعر حیدر قریشی کا اپنی ماں جی سے محبت، تعلق اور شفقت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔اپنی ماں جی سے اپنی محبت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔(۲۶)

حیدر قریشی کی والدہ ادبی ذوق رکھتی تھی۔انہوں نے پنجابی میں ایک دعائیہ نظم کہی تھی جس کا ذکر ان کے اس خاکے میں ملتا ہے۔لکھتے ہیں:

''امی جی میں جمالیاتی ذوق کی فراوانی تھی۔ستم ہائے زمانہ نے اسے کچلا تو دیا مگر ختم نہ کر سکا۔امی جی نے ایک زمانے میں پنجابی میں ایک طویل دعائیہ نظم کہی تھی اس کی ردیف ''مولا'' اور قافیہ دعا، صدا وغیرہ تھا۔اتنا ہی مجھے یاد ہے۔'' (۲۷)

حیدر قریشی کی شاعری اور افسانوں ( آپ بیتی، دھند کا سفر اور روشنی کی بشارت ) میں ان کی والدہ کا ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

میرے متعدد افسانوں میں امی جی کا کردار اپنی توانائیوں کے ساتھ براہ راست موجود ہے۔''دھند کا سفر''، ''آپ بیتی'' اور ''روشنی کی بشارت'' یہ تینوں افسانے ان کی زندگی میں ہی ''نگار پاکستان'' ''اوراق'' اور ''جدید ادب'' میں چھپ گئے تھے۔''روشنی کی بشارت'' پڑھ کر کہنے لگیں کبھی میں تمہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی اور اب تم میری کہانیاں بنانے لگ گئے ہو۔ (۲۸)

زیر نظر خاکے میں حیدر قریشی کے ان اشعار کا بھی ذکر ملتا ہے جو انہوں نے اپنی ماں کی یاد میں کہے۔ملاحظہ ہو۔

یہ ساری روشنی حیدر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

۲۶۔ قریشی، حیدر، میری محبتیں، دہلی: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص،۱۴۔۱۵
۲۷۔ ایضاً، ص،۱۶۔۱۷۔
۲۸۔ ایضاً، ص،۱۷۔

حیدر اب اپنی عادتیں ، اطوار ٹھیک کر
ابا جی بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

حیدرقریشی کے لکھے اس خاکے کو پڑھ کر ان کی والدہ کی شخصیت کھل کر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔وہ ماں سے کس قدر قریب تھے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ بلا شبہہ یہ ایک خوبصورت خاکہ ہے۔''پسلی کی ٹیڑھ'' کتاب میں شامل آٹھواں خاکہ ہے جو حیدرقریشی نے اپنی بیوی کا لکھا ہے۔خاکے کی ابتدا نہایت ہی خوبصورت شعر سے کی گئی ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

اس خاکہ کو لکھنے سے پہلے حیدرقریشی اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ کہیں ان سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔شاید اسی وجہ سے انہوں خاکے کی ابتدا سے پہلے ہی سچ لکھنے کا اقرار کر لینا مناسب سمجھا۔لکھتے ہیں۔

بیوی۔۔۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔اللہ میری حفاظت فرمائے۔(آمین)(۲۹)

زِیرنظر خاکے میں حیدرقریشی نے اپنی اہلیہ (مبارکہ) کی شخصیت سے قاری کو بخوبی متعاف کرایا ہے۔لکھتے ہیں'' مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔'' (۳۰)

یہ خاکہ حیدرقریشی اور ان کی بیوی کے درمیان محبت، سمجھ، اور رشتہ پہ اعتماد کی کھلی وضاحت کرتا ہے۔حیدرقریشی کا یہ خاکہ میاں بیوی کے درمیان ایک صحت مند رشتہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں میں شباہت یکساں ہو جاتی ہے۔فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔ ''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت

.................................................................

۲۹۔ حیدرقریشی، میری محبتیں، دہلی: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸،ص،۵۷۔

۳۰۔ ایضاً،ص،۶۰۔

کی شدت تو ثابت ہوگئی۔(۳۱)

حیدرقریشی اوران کی بیوی مبارکہ کے درمیان کس حد بےتکلفی اوراعتماد کا رشتہ قائم ہے یہ بات اس خاکہ میں مکمل طور پرنظر آتی ہے۔بالآخر حیدرقریشی لکھتے ہیں''اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرات نہیں۔اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعد لکھوں یا میری وفات کے بعد وہ لکھے گی۔

کتاب **''میری محبتیں''** کے دوسرے حصّے میں حیدرقریشی نے دس ایسی شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔جن سے کسی نہ کسی طور پر انہوں نے فیض حاصل کیا ہے۔دوسرے حصے کا پہلا خاکہ (اردو ادب کے نوبل پرائز) میرزا ادیب کا لکھا۔حیدرقریشی کو میرزا ادیب سے ملاقات کر کے ہمیشہ روحانی خوشی کا احساس ہوا ہے۔میرزا ادیب کئی ادبی جہات کے مالک ہیں۔اس خاکے میں حیدرقریشی ہماری ملاقات فنکار میرزا ادیب سے کرواتے ہیں۔لکھتے ہیں۔

''میرزا ادیب بحیثیت ادیب کئی جہات کے حامل ہیں۔رومان نگار،افسانہ نگار،ڈرامہ نگار،خاکہ نگار،کالم نگار،سوانح نگار۔اس نگار خانے سے ہٹ کر میرزا ادیب بچوں کے لئے لکھنے والے ادیب بھی ہیں اور''ادب لطیف'' کے درخشندہ دور میں اس کے مدیر بھی رہے ہیں۔''(۳۲)

میرزا ادیب سادہ مزاج کے آدمی ہیں۔انہوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی مگر ان کی ادبی خدمات کا ابھی تک صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں حیدرقریشی لکھتے ہیں:

میرزا ادیب نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ادب والوں نے اس کا صلہ صرف اتنا دیا کہ ان کی بعض کتابوں پرمختلف انعامات دے دیئے۔۔۔۔میرزا ادیب کی ادبی خدمات نصف صدی کا قصہ نہیں ہیں۔۔۔۔۔میرزا ادیب اپنی ادبی زندگی کے پچپن سال بھی کبھی کے پورے کر چکے ہیں۔کیا ہمارے ادبی اداروں کو کم از کم اتنی توفیق بھی نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی''ادبی گولڈن جوبلی'' مناڈالیں؟(۳۳)

دوسرے حصے کا دوسرا خاکہ (ہم کہ ٹھہرے اجنبی) فیض احمد فیض پر لکھا خاکہ ہے۔فیض سے حیدرقریشی کی ملاقات کم ہی ہوئی،ان کے درمیان خط وکتابت کا تعلق رہا۔اس وقت حیدرقریشی ادب میں نووارد تھے۔شخصی حوالے

..................................

۳۱۔حیدرقریشی،میری محبتیں،دہلی:نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۸،ص،۵۹۔۶۰۔

۳۲۔حیدرقریشی،میری محبتیں،دہلی:نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۸،ص،۸۱۔

۳۳۔ ایضاً،ص،۸۴۔

سے وہ فیض احمد فیض کو جتنا جانتے تھے اس خاکے میں انہوں نے اتنا ہی لکھا۔ایک بھی لفظ کی زیادتی سے گریز کیا۔لکھتے ہیں۔

> فیض احمد فیض اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہیں۔شخصی حوالے سے دیکھا جائے تو ایک ملاقات اور چند خطوط کے تبادلے ہمارے درمیان تعلق کی وہ صورت پیدا نہیں کر سکے جو اجنبیت کو دور کرنے والی ہوتی ہے۔یوں کہہ سکتا ہوں کہ میں فیض کے معاملے میں اجنبی کا اجنبی ہوں،لیکن فیض کی شاعری اور شخصیت دونوں میں اتنا جادو ہے کہ دور بیٹھے ہوؤں کو بھی اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔سو میں فیض کے ایسے اسیروں میں سے ہوں اور اس لحاظ سے ان کا شناسا بھی ہوں۔(۳۴)

''عہد ساز شخصیت'' (ڈاکٹر وزیر آغا) حیدر قریشی کا لکھا یہ خاکہ کتاب کے دوسرے حصے کا تیسرا خاکہ ہے۔جو کہ پہلے دو خاکوں سے نسبتاً مختلف انداز کا حامل ہے۔پہلے دونوں خاکوں (اردو ادب کا نوبل پرائز، ہم کہ ٹھہرے اجنبی) میں حیدر قریشی نے میرزا ادیب اور فیض احمد فیض کی شخصیت کا جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارناموں کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔جبکہ اس خاکے (عہد ساز شخصیت) میں انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ظاہری شخصیت اور ان کے خیالات سب کا احاطہ کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات کے بعد حیدر قریشی کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ بھی وہ سوچتے ہیں سمجھتے ہیں،ان میں سے بہت کچھ ان کی گرفت سے باہر ہے وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔ادبی نظریات کے حوالے سے وہ خود کو ڈاکٹر وزیر آغا سے قریب پاتے ہیں۔لکھتے ہیں۔

> یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے علمی سطح پر میری پہلی ملاقات تھی۔اس کے بعد ''نظم جدید کی کروٹیں'' اور نئے مقالات'' کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید دو ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آپاتا وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے (۳۵)

ڈاکٹر وزیر آغا سے حیدر قریشی کا تعلق بہت قریب کا رہا۔فکری سطح کے ساتھ ان کے درمیان ذاتی رابطہ بھی قائم رہا۔اس خاکے میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ اپنے گہرے مراسم اور شخصی اوصاف کو موضوع سخن بنایا۔لکھتے ہیں۔

---

۳۴۔ ۳۱۔حیدر قریشی،میری محبتیں،دہلی: نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۸،ص،۸۵۔
۳۵۔ ایضاً،ص،۹۰۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا تعلق کسی تعارف کے بغیر فکری سطح پر پہلے قائم ہوا تھا ذاتی رابطہ اور شخصی سطح پر تعلق بہت بعد میں قائم ہوا۔ میں نے وزیر آغا سے اپنے تعلق اور نیاز مندی کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ایک خانہ علمی اور فکری تعلق کا ہے۔ایک خانہ شخصی اور ذاتی تعلق کا ہے۔علمی لحاظ سے میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا استاد اور رہنما سمجھتا ہوں۔ان کی تنقید اور فکر سے میں نے ادبی رہنمائی حاصل کی ہے۔(۳۶)

حیدر قریشی ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر کے مداح تو اس وقت سے تھے جب انہوں نے ''تنقید اور احتساب'' کا مطالعہ کیا تھا۔تاہم حیدر قریشی جو کہ اس وقت ادب کی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔وزیر آغا سے حیدر قریشی کی پہلی ملاقات ''جدید ادب'' کے لیے ادبی تحریر کے حصول کی بنا پر ہوئی ۔ڈاکٹر انور سدید نے انہیں اس کام کے سلسلے میں دوسرے ادیبوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کا پتہ بھی دیا۔اور حیدر قریشی کی درخواست پر وزیر آغا نے محبت کے ساتھ انہیں اپنی نگارشات عطا کیں۔ اور بہت جلد دونوں مصنفین ایک دوسرے سے قریب ہو گئے ،اس قربت کی اہم وجہ دونوں کی ادب سے دلچسپی تھی۔خاکے میں حیدر قریشی وزیر آغا کے ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ ان کے شخصی اوصاف کو بھی قارئین کے سامنے لاتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہیں کہ وزیر آغا ذاتی زندگی میں دوستوں کی خوشی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ان کی خوبی تھی کہ وہ دوستوں کی توجہ ادبی مطالعہ کی طرف لانے کی کوشش کرتے تھے۔ان کے دوستوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں اور وزیر آغا نے انہیں بھی انگریزی ادب سیکھنے کی تلقین کی۔ یہ الگ بات ہے کہ حیدر قریشی نے یہ کہہ کر دامن بچا لیا کہ انگریزی ادب پڑھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی زندگی میں انہیں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑا جو ان کے مخالفین تھے۔لیکن وزیر آغا نے ہمیشہ اپنی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے انہیں مسکرا کے گلے لگایا ہے۔''وزیر آغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر اس کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔''(۳۷)ڈاکٹر وزیر آغا وسیع المطالعہ شخص تھے اور ہر موضوع پر بلا تکان گفتگو کر سکتے تھے۔حیدر قریشی لکھتے ہیں۔''الٰہیاتی مسائل،روح کی حقیقت،انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں۔ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔''(۳۸)

---

۳۶۔ حیدر قریشی،میری محبتیں،دہلی: نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۸،ص۹۱۔
۳۷۔ حیدر قریشی،میری محبتیں،دہلی: نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۸ص،۹۳۔
۳۸۔ ایضاً،ص،۹۴۔

ان کے علاوہ حیدر قریشی نے اور بھی مختلف ادبی شخصیات اور دوستوں ( غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی ، عذرا اصغر،سعید شباب ،محمد اعجاز اکبر،طاہر احمد ) کے خاکے لکھے۔حیدر قریشی نے ان خاکوں میں ایک ہمدردانہ انداز اختیار کیا ہے اور بڑے مثبت انداز میں ان کے شخصی اوصاف مثلاً صاف گوئی ،سادگی ،علمی وسعت کو بیان کیا ہے۔غرض حیدرقریشی کے تحریر کردہ خاکوں میں خلوص اور ہمدردی کا عنصر نمایاں ہے۔اس لیے تو ان کے خاکے کا وصف یہ ہے کہ وہ بڑے فنکار اور عام انسان سے قارئین کو متعارف کراتے ہیں ۔حیدر قریشی نے نہایت سادہ اور دلکش انداز میں زیرِ بحث شخصیت کے کچھ شخصی اوصاف اور فنی خصوصیات عمدگی سے بیان کی ہیں ۔ساتھ ہی ساتھ ان خاکوں میں افسانہ نگار اور انشائیہ نگار حیدرقریشی کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ تاہم یہ خاکے خاکہ نگاری کے معیار پر پورا اترتے ہیں ۔اندازِ تحریر بہت رواں اور سبک ہے۔

مختصر یہ کہ خاکوں کا یہ تجربہ حیدرقریشی کی بصیرت افروز شخصیت کے مختلف رنگ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔بقول مقصود الٰہی شیخ۔

> آپ کی کتاب ’’میری محبتیں‘‘ دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے، پسند آیا۔آپ نے مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں،آپ کو اس کی داد ملے گی ۔ بڑی بے ساختگی ہے ،روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے ۔آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔(۳۹)

**انشائیہ:**

خود کو کسی ایک صنف پر مرکوز نہ رکھنے والے حیدرقریشی اردو ادب میں انشائیہ نگار کی صورت میں بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔’’ فاصلے قربتیں‘‘ دس انشائیوں پر مشتمل کتاب ہے۔زیرِ عنوان کتاب الگ سے مطبوعہ نہیں ہوئی بلکہ ان کی کلیات ’’عمر لا حاصل کا حاصل‘‘ میں شامل ہے، جو ۲۰۰۵ میں منظر عام پر آئی۔اس میں شامل انشائیہ عنوانات کے اعتبار سے اس طرح ہیں:

۱۔خاموشی

.........................................

۳۹۔ عکاس اسلام آباد (حیدر قریشی نمبر ) اکتوبر ۲۰۰۵ص،۴۱

۲۔نقاب

۳۔وگ

۴۔فاصلے قربتیں

۵۔بڑھاپے کی حمایت میں

۶۔اطاعت گزاری

۷۔یہ خیر وشر کے سلسلے

۸۔چشمِ تصور

۹۔اپنا اپنا سچ

۱۰۔تجربہ اور تجربہ کاری

حیدرقریشی کے انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں لہجہ کی اکائی،معنوی پھیلاؤ اور اسلوب کی انفرادیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ان کی تحریروں میں جذبہ کی صداقت،نظریاتی وسعت،فکر کی گہرائی، انداز بیان اور اسلوب کی ندرت وجدت ہر انشائیہ سے ظاہر ہے۔خاور اعجاز کی رائے ملاحظہ کیجیے:''حیدرقریشی کے انشائیوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ان کی فتوحات اور شکستوں کے ساتھ موجود ہیں جو ان کے انشائیوں میں کہیں خاکہ نگاری کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور کہیں یادنگاری کا۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان ساری کیفیات کے پردے سے ایک انشائیہ ابھار لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔'' (۴۰)

اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع سخن بنا کر جس انداز سے پیش کیا، یقیناً ان جواہر پاروں پر انفرادیت کی چھاپ ہے۔معمولی کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا حیدرقریشی کی انفرادیت میں شامل ہے۔موضوعاتی اعتبار سے انہوں نے روزمرہ کے معمولی اور ان دیکھے واقعات کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا۔ان کی گہری فکر کا اندازہ ان اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔اسی طرح سناٹا اور ویرانی بھی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ان کے برعکس

..............................

۴۰۔ عکاس اسلام آباد (حیدرقریشی نمبر) اکتوبر ۲۰۰۵،ص،۵۶۔

خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ جو لوگ سناٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔ سناٹا بے روح اور بے آواز ہوتا ہے جبکہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں، زندگی کو جنم بھی دیتی ہے۔
**(خاموشی)**

کوئی انسان آج تک خود کو پوری طرح نہیں دیکھ سکا، نہ ہی تا حال کوئی ایسا آئینہ دریافت ہوسکا ہے جو انسان کے اندر کے سارے بھید اس پر کھول سکے۔ **(نقاب)**

خاموشی اپنے اندر معنویت کے بے پناہ امکانات رکھتی ہے جبکہ آواز کی قید میں آنے والے لفظ مخصوص اور محدود معنویت کے حصار میں آجاتے ہیں۔ **(خاموشی)**

ان کے انشائیوں میں معنی آفرینی اور حسن کاری ہر سطر سے ظاہر ہے۔ الفاظ وتراکیب سے جو واقعہ نگاری کی ہے وہ مرقع سازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کے انشائیوں کی بنیاد مستحکم اور جڑیں نہایت مضبوط ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر ''زُلف دراز'' والی وگ ہے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زُلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہیں اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔ یہ دنیائے موجود ، رات بھر کسی محبوبہ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے لیکن دن ہوتے ہی سورج کی تپش سے گھبرا کر اس وگ کو اتار کر رکھ دیتی ہے۔ **(وگ)**

بڑھاپا بارش کے بعد قوس قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔ زندگی کے تجربوں کی دھوپ سے ہفت رنگ عکس اُبھرتا ہے اور ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔ گرد وغبار دُھل جاتا ہے۔ چاروں طرف تازگی اور ہریالی کا سماں ہوتا ہے۔ ہلکی ہلکی اور ٹھنڈی میٹھی ہوا انسان کو وہ آرام وسکون بخشتی ہے جو بخارات اٹھنے کے عمل یا موسلا دھار بارش کے دوران ہرگز نصیب نہیں ہوسکتا۔
**(بڑھاپے کی حمایت میں)**

اس سلسلے میں فیصل عظیم رقم طراز ہیں۔

ان کے انشائیے محض لایعنی اشیا کو ادب میں خوبصورتی سے جگہ دینے اور یوں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو منوانے پر ختم نہیں ہوتے بلکہ ان سے متعلق معاشرے کے اصل مسائل اور موضوعات انشائیوں میں حلول کیے ہوتے ہیں جن پر مضمون یا مزاح لکھنا آسان ہوتا ہے۔ مگر انشائیہ لکھنا اور اس ''غیر ہضم شدہ'' صنف میں اپنا پیغام پہنچا دینا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے انشائیوں کی یہ خوبی قابلِ ستائش ہے اور ان میں چھپا خفیف تبسم انشائیے کا تحفۂ خاص۔ (۴۱)

---

۴۱۔ ''اتنا سب کچھ ایک ساتھ''، مشمولہ، ادب ساز، (دہلی)، سہ ماہی، شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۳۰۔

آسان اور سادہ الفاظ میں معنی خیز جملے کہہ جانا حیدرقریشی کا وصف ہے۔ان کے انشائیے لوگوں کو پسند آئے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ (خاموشی)

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنّت کے درمیان عالمِ برزخ ہے۔ (نقاب)

خاموشی خیر کی علامت ہے جبکہ شور شر کا مظہر۔ (خاموشی)

قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطرہ کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من وتو ختم ہو جائے گا۔ (فاصلے،قربتیں)

گرگٹ بیچارے کو ہر کوئی لعن طعن کرتا ہے جبکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ نہیں کہ آئینے اور پانی کی طرح یہ بھی جہاں سے گزرتا ہے اسی رنگ میں رنگین نظر آنے لگتا ہے۔آئینہ، پانی اور گرگٹ تینوں اپنی اپنی جگہ سچّے ہیں۔ (اپنا اپنا سچ)

غرض یہ کہ حیدرقریشی کے انشائیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیدرقریشی کے انشائیے قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔اردو ادب میں وہ ایک کامیاب انشائیہ نگار کی صورت میں بھی پہچان رکھتے ہیں۔

## یادنگاری:

حیدرقریشی نے اپنی یادوں کو بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ان کی یادیں ان کے لیے کسی قیمتی سرمائے سے کم نہیں۔حال ماضی میں تبدیل ہو کر انسان کے دامن میں یادوں کا تحفہ دے جاتا ہے۔یہ یادیں ہی ہیں جنہیں ہم تمام عمر سنبھال کر رکھتے ہیں جہاں اچھی یادیں کسی بھی وقت انسان کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ دے جاتی ہیں وہیں بُری یادیں زندگی کی بہت سی تلخ حقیقتیں سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔حیدرقریشی بُرے اور اچھے میں فرق کرنا جانتے ہیں۔بُرائی میں اچھائی کی تلاش انسان کو زندگی کی طرف مثبت سوچ کے ساتھ لے جاتی ہے۔حیدرقریشی کے یہاں ہمیں ایسا ہی کچھ نظر آتا ہے۔حیدرقریشی نے اپنی زندگی کی اچھی بُری یادوں کو **”کھٹی میٹھی یادیں“** بنا کر قاری کے سامنے پیش کیا،اور ایک یادنگار کے طور پر سامنے آئے۔زیرِنظر کتاب میں حیدرقریشی نے ۲۱ مضامین

تحریر کیے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ان مضامین میں انہوں نے اپنی زندگی کے چالیس سالہ یاداشت کا احاطہ کیا ہے۔

کتاب **''کھٹی میٹھی یادیں''** ان کتابوں میں سے ہے جو رفتہ رفتہ اپنی معنویت اور دلکشی کا اسرار کھولتی ہیں اور آہستہ آہستہ قاری کو اپنی دنیا میں جذب کر لیتی ہیں۔اگر واقعات کے تسلسل اور کہانی کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو حیدر قریشی کی زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔حیدر قریشی کی جذباتی نشونما میں در آنے والی رکاوٹیں،فرد کی نجی و شخصی زندگی پر سماجی عوامل کا گہرا دباؤ،ماحول اور ورثے کی میکانیت،نفسی کیفیات کا خارجی حالات پر غالب آنا اور ذہنی و فکری ارتقا پر اثر انداز ہونے والے اسباب و علل کا تجزیہ اس کتاب کا موضوع ہے۔جوگیندر پال رقم طراز ہیں:

حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے منھ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔حیدر قریشی چونکہ پورا منھ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لئے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کے محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے اور یوں وہ مطالعہ کو بے تامل اپنی مرضی اور خواہش سے گھٹاتے بڑھاتے گویا اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنے معمول کے دوران اس سے عین مین مل کر اپنے نتائج اخذ کر رہا ہوتا ہے۔ (۴۲)

گویا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حیدر قریشی اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے نئے سرے سے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں۔کسی کمی کو پورا کرنے کے طلب گار ہیں۔حیدر قریشی کی زندگی میں ان کے عزیز اور احباب کی کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ کتاب کے پہلے مضمون ''بزمِ جاں'' کی ابتدا سے لگایا جا سکتا ہے۔

''میری محبتیں'' کی اشاعت سے پہلے ہی مجھے احساس تھا کہ اس میں شامل بعض شخصیات ایسی تھیں کہ ان پر مزید لکھا جانا چاہیے تھا۔بعض لوگ جن کا بیچ بیچ میں برسبیلِ تذکرہ نام آ گیا ہے،ان کی زندگی کے بعض خوبصورت انسانی رُخ بھی سامنے آنے چاہئیں تھے۔بہت سارے عزیز اور احباب ایسے ہیں جن کا پورا خاکہ نہیں لکھا جا سکتا لیکن ان کے ذکر کے بغیر میری زندگی کی روداد بھی ادھوری رہے گی اور میری محبتیں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مزید خاکہ نگاری تو جب بھی ہوئی اپنے

.........................

۴۲۔ ادب ساز دہلی،سہ ماہی،(خصوصی مطالعہ:حیدر قریشی) شمارہ:جنوری تا جون ۲۰۰۸،ص،۲۹۔

وقت پر ہوگی۔فی الوقت میں اپنی زندگی۔۔۔گزاری ہوئی زندگی کی طرف تو پلٹ کر دیکھ سکتا ہوں۔اپنے بہت سارے پیاروں، رشتہ داروں اور' کرم فرماؤں'' سے تجدیدِ ملاقات تو کرسکتا ہوں۔سوبکھری ہوئی یادوں کوجمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔(۴۳)

اس خودنوشت سوانح سے حیدرقریشی کی شخصیت کے بہت سے پہلوکھل کرسامنے آتے ہے جیسے کہ وہ کس قدر صابر اور ذہین بچے تھے۔اسکول کی بزم ادب میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کرحصہ لیا۔اپنی ذہانت کی بنا۔پر کچی پکی کلاسوں کے بجائے دوسری جماعت میں داخلہ ملا۔اسکول کے زمانے سے ہی رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔معاشی مسائل کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے میں دشواری بھی ہوئی۔لیکن انہوں نے ملازمت کے ساتھ تعلیم کو جاری رکھا۔اس وقت پاکستان کی سیاست کا کیارنگ تھا۔ذوالفقارعلی بھٹواور جنرل ضیاءالحق کے منصوبے کس طرح ایک دوسرے سے مختلف تھے اس کا بھی اندازہ ہوتاہے۔انہوں نے کہیں بھی حقیقت کا دامن نہیں چھوڑا۔لکھتے ہیں کہ۔''میں نے اپنے خاکوں اور یادوں میں جو کچھ لکھا ہے،وہ سب سچ ہے۔بیتا ہوا سچ ،دیکھا ہوا سچ یا سنا ہوا سچ اور وہ انکشافی سچ جوکسی تخلیق کارکونصیب سے ملتا ہے۔''(۴۴)

تہذیب واقتدار کی تبدیلی، سائنس اور مذہب کا تعلق، زندگی اور کائنات کی حقیقت اوراردوادب کے متعلق ان کا نظریۂ فکران تمام پہلوؤں پرحیدرقریشی نے کھل کرگفتگو کی ہے۔غرض حیدرقریشی نے یادوں کے اس سفرکواپنے منفرد انداز میں طے کیا ہے۔

## سفرنامہ:

سفرنامہ کے معنی داستانِ سفر،رُودادسفر یا سفر کے قصّے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔سفرنامہ بظاہر ایک سنجیدہ تخلیقی عمل ہے۔سفرنامہ نگار زندگی کو ہموار،معتدل اور متوازن نظر سے دیکھتا ہے اور ایک سنجیدہ سفرنامہ تخلیق کرتا ہے۔حیدرقریشی نے اردوادب میں تخلیقی جوہر دکھانے کے علاوہ سفرنامہ کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔(''سوئے حجاز''،سفرنامہ۔عمرہ کا احوال )معیارپبلی کیشنز،دہلی سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔بعدسفرحج کے یہ

.................................................................................................

۴۳۔ حیدرقریشی،عمرلاحاصل کا حاصل،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص،۳۸۵۔

۴۴۔حیدرقریشی،عمرلاحاصل کا حاصل،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص،۵۰۴۔

کتاب ''سوئے حجاز''ہی کے نام سے سرور ادبی اکادمی، جرمنی سے۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔یہ سفر نامہ دراصل حیدرقریشی کے حج اور عمرہ کی یادگاریں ہیں۔حیدر قریشی نے دوران سفر اپنا زیادہ وقت عبادت اور ماحول کے مشاہدے میں گزارا اور جو کچھ دیکھا اسے اپنی لوحِ دماغ پرلکھ کر ایک مربوط بیانیہ کی شکل دے دی۔اس قسم کے سفر ناموں میں سیاح منظرکوذہنی سطح پر دوبارہ زندہ کیا جاتا ہےاور جس سے تخیل کوبھی راہ مل جاتی ہےاورسفر نامے میں بھی افسانے کا اسرار پیدا ہو جاتا ہے۔حیدرقریشی کا یہ سفر نامہ مکمل طور پر روحانیت سے وابستہ ہے۔اس سفر نامہ سے حیدر قریشی کا مذہب کے تئیں جو نظریہ ہے اس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔بہ قول حیدرقریشی :''میرا یہ سفر ویسے تو جسمانی،فکری اور روحانی تینوں سطحوں پر ہوا تھا اور تینوں سطحوں پر اس کے اثرات مجھے آج بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن اس سفر کے روحانی اثرات تو جیسے میری روح کی گہرائیوں تک رچ بسے ہوئے ہیں۔'' (۴۵)

حیدرقریشی نے اپنا سفر نامہ بیانیہ تکنیک میں تحریر کیا ہے۔ابتدائی اور قدیم سفر نامے بھی اسی تکنیک میں پیش کیے جاتے تھے۔اس میں لکھنے والا چشم دید واقعات اور مشاہدات کو قارئین کے سامنے تحریری طور پر پیش کرتا ہے۔سفر نامہ نگار ایسی تحریر کا خود ہی ہیرو ہوتا ہے۔وہ اپنے سفر کے تمام کوائف اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔اس لیے یہ آپ بیتی سے بہت قریب ہے۔حیدرقریشی کا تہذیبوں اور ثقافتوں کے متعلق مطالعہ بھی خاصا ہے۔اس سفر نامہ میں انہوں نے حجاز کے تاریخی مقامات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ان کے اس مطالعہ اور مشاہدے کی جھلک مضامین ''مکہ کے تاریخی اور مقدس مقامات'' اور'' مدینہ کے مقدس اور تاریخی مقامات'' میں نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔آیئے ان کے مضمون'' مکہ کے تاریخی اور مقدس مقامات'' سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

> عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے ہوئے ایک دیوارسی دکھائی دی۔استفسار پر پتہ چلا ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے جو تاریخی نہر بنوائی تھی، یہ وہی ہے۔اُس زمانے میں دجلہ وفرات سے یہاں مکہ تک حاجیوں کے لئے اور مسافروں کے لئے اتنی شاندار نہر بنوا دینا بہت بڑی بات تھی۔مزدلفہ کے قریب مسجد مشعرالحرام ہے، یہ مسجد صرف حج والی رات کھلتی ہے۔۔۔
> ۔۔۔یہاں سے آگے بڑھے تو وادئ محسّر اور جبل الابابیل نظر آئے۔جبل الابابیل وہ پہاڑ ہے جہاں سے ابابیلوں نے کنکر اٹھائے تھے اور خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے آنے والے یمن کے بادشاہ کے، ہاتھیوں پر سوار عظیم لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ

.................................................

۴۵۔ حیدرقریشی،سوئے حجاز،دہلی:معیار پبلی کیشنز۲۰۰۰،ص،۱۱-۱۰۔

دیا تھا۔یمن کا بادشاہ ابراہہ مسیحی تھا۔اس نے خانہ کعبہ سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے صنعاء میں ایک عالی شان گر جاتعمیر کرایا تھا۔ (۴۶)

مضمون ''مدینہ منورہ کے مقدس اور تاریخی مقامات'' سے اقتباس۔

سب سے پہلے احد کے پہاڑ پر پہنچے۔ یہاں غزوۂ احد کے ۷۳ شہداء کے مزار ہیں۔حضرت حمزہؓ حضرت جحشؓ اور حضرت معصب بن عمیرؓ کے مزار سامنے سے دکھائی دیتے ہیں، باقی ستر شہداء کے مزار آگے ہیں۔ یہاں حضرت حمزہؓ سمیت تمام شہدائے احد کے لئے دعا کی۔۔۔۔۔ مسجد قبلتین کا مطلب ہے دو قبلوں والی مسجد۔۔۔ پہلے شمالی جانب (بیت المقدس کی طرف) قبلہ تھا۔اسی مسجد میں نماز کے دوران تحویل قبلہ کا حکم ہوا اور دورانِ نماز ہی حضورؐ نے شمال سے جنوب کی طرف رُخ فرمالیا کہ خانہ کعبہ جنوب کی طرف ہے۔اس تبدیلی سے بعض صحابہ نے شدید ٹھوکر کھائی۔بعض نماز چھوڑ کر بھاگ گئے۔بعض نے اسلام سے علیحدگی کر لی۔ میں مسجد قبلتین کے اندرونی حصہ میں جا کر شمالاً جنوباً دیکھنے لگا۔مری سمجھ بوجھ کے مطابق قبلہ کی فلاسفی مجھ پر کھلنے لگی۔خدا لامحدود ہے۔لامحدود ہستی کسی محدود مکان میں نہیں آسکتی۔ (۴۷)

حیدر قریشی کے سفر نامے سوئے حجاز کی فکری سطح کا جائزہ لیں تو بہت سے نئے نئے پہلو آشکار ہوتے ہیں۔فکری سطح کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

خدا کے بارے میں دو بڑے تصور مختلف صورتوں میں ہمیشہ سے رہے ہیں۔ایک تصور انوار پرستی کا اور دوسرا ارض پرستی کا۔ارض پرستی سے زمین کے درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، بعض جانوروں اور بتوں کو مقدس مانا گیا اور انوار پرستی سے سورج، چاند، ستاروں اور آگ کی پرستش کو رواج ملا۔اصل میں تو یہ سارے تصورات اور عقائد خالقِ کائنات کی جستجو کے سفر ہیں۔بس! سفر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔اسلام نے اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا۔دوسری طرف بت پرستی کو ختم کر کے خانہ کعبہ کو زمینی مرکز بنا دیا۔یوں اسلام نے انوار پرستی اور ارضی پرستی کے مروجہ تصورات سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالقِ کائنات کے بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔(۴۸)

حیدر قریشی کے سفر نامے فکری سطح کے ساتھ ساتھ ادبی نوعیت کے بھی ہی۔ان کے سفر نامے میں ادبی رنگ کی مثال ملاحظہ ہو۔

.....................................

۴۶۔ حیدر قریشی، عمر لا حاصل کا حاصل، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص، ۶۲۷۔

۴۷۔ حیدر قریشی، عمر لا حاصل کا حاصل، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ۲۰۰۵، ص، ۶۴۷۔

۴۸۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، دہلی: معیار پبلی کیشنز ۲۰۰۰، ص، ۲۷۔

میں نے منیٰ میں بڑے شیطان کو دیکھتے ہوئے خیال ہی خیال میں اسے کنکریاں مار دیں اور خیال ہی خیال میں دیکھا کہ وہی کنکریاں پلٹ کر مجھے آ لگی ہیں۔ شیطان اس تماشے پر مسکرا رہا اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم آج کے انسان روایتی شیطان سے کتنا آگے نکل گئے ہیں۔ اگلے زمانوں میں کسی پر تکبر کا بھوت یا شیطان سوار ہوتا تو وہ براہِ راست خدائی کا دعویٰ کر دیتا تھا لیکن آج کا متکبر انسان چالاک ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے کی بجائے خدا کو اپنی مذموم نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک ذریعہ اور بہانہ بنا بیٹھا ہے۔ اپنی انسانی حالت میں ریاکاری کی عاجزی بھی دکھائی اور خدائی کے سارے اختیارات بھی سنبھال لیے۔ یہی تو وہ ذہانت ہے جو نہ فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کو نصیب ہوئی نہ شیطان کو ہی سوجھ پائی۔ (۴۹)

حیدر قریشی کے سفر نامہ کا اسلوب بہت خوبصورت ہے۔ حیدر قریشی نے سفر کے جزئیات کو خوبصورت، دلکش اسلوب میں یوں پیش کیا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔ ان کے سفر نامہ کی نثر شگفتہ، رواں اور دلکش ہے۔ ان کی ہلکی پھلکی اور معلوماتی گفتگو سے یہ سفر نامہ تشکیل پاتا ہے۔

## تنقید:

تنقید ایک فطری عمل ہے۔ ایک فطری خاصیت ہونے کی بنا پر تنقید کی صلاحیت ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ادب اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزم ہیں کیونکہ کسی بھی قوم کا ادب تنقید کے سہارے کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا، اسی لیے اردو میں تنقید ایک مستقل حیثیت کی حامل ہے اور مسلسل ارتقا پزیر ہے۔ تنقید چونکہ زندگی کو سمجھنے کی ایک اہم کوشش کرتی ہے۔ اس لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں سے ایک ہے۔ ادبی تنقید ادب کے نشیب وفراز کا سراغ لگاتی ہے۔ اس کو انسانی حدود کے اندر رکھتی ہے اور یہی اس کا بنیادی مقصد کہا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی کے فنی سفر کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ تنقید کے میدان میں بھی قدم رکھا، اور اپنے منفرد خیالات تنقیدی مضامین کی شکل میں پیش کیے۔ حیدر قریشی کی تنقید کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر کے بہاؤ میں قاری کو اس طرح گرفت میں لے لیتے ہیں کہ وہ غیر محسوس انداز میں مطالعہ میں غرق ہو جاتا ہے۔ ان کے فکر انگیز مباحث نے تحریر کی دلکشی میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ حیدر قریشی نے نت نئے مسائل اور موضوعات پر طبع آزمائی کر کے اپنی تحریر کو جمود سے بچایا۔ تنقید میں ان کا جو اہم کام ہے وہ ماہیا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے ہے۔

---

۴۹۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، دہلی: معیار پبلی کیشنز ۲۰۰۰، ص ۴۷۔۴۸۔

حیدرقریشی کا تنقیدی نظام بہت ہمہ گیر اور وسیع ہے۔انہوں نے ادبی مسائل کوموضوع بحث بناتے ہوئے مختلف مضامین لکھے۔حیدرقریشی کے مضامین کے اسالیب کی جدت اورتنوع قاری کو بورنہیں ہونے دیتی۔دقیق علمی مباحث خوشگوار طریقہ سے زیر بحث لائے گئے۔کہیں بھی تحریرکو یکسانیت کا شکارنہیں ہونے دیا۔انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں طنزیہ فقروں سے قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ان کی تحریرایک ہلکی پھلکی اورمتاثرکن انداز کی حامل ہے۔وہ اپنے تخلیقی مسائل کے بھرپورادراک اورتنقیدی نظام کی ہمہ گیری کی بنا پرمنفردنظرآتے ہیں۔حیدرقریشی کی تحقیقی اورتنقیدی کتب کودوحصوں ( تاثرات اور ماہیے ) میں تقسیم کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔

**(الف) تاثرات:**

۱۔حاصل مطالعہ

۲۔تاثرات

۳۔ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت

۴۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت

۵۔ ہمارا ادبی منظر نامہ( چاروں کتابوں کا مجموعہ

**(ب) ماہیا:**

۱۔اردو میں ماہیا نگاری

۲۔اردو ماہیا کی تحریک

۳۔اردو ماہیا کے بانی ہمت رائے شرما

۴۔اردو ماہیا( ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ )

۵۔ ماہیے کے مباحث

۶۔اردو ماہیا تحقیق وتنقید( پانچوں کتابوں کی ایک جلد )

**ڈاکٹر وزیرآغا۔عہد ساز شخصیت:**

حیدرقریشی کی یہ کتاب ان کے تنقیدی مضامین پرمشتمل ہے۔اس کتاب میں انہوں نے ڈاکٹر وزیرآغا سے

اپنے ذاتی تعلقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجربات کو بیان کیا ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔دوسرے ایڈیشن میں ''میں اور اوراق'' اور ''اوراق اور ماہیا '' دو مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔یہ دو مضامین اوراق کے پینتس سالہ نمبر کے موقعہ پر وزیر آغا کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔اپنی اس کتاب کے بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''میری یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے گزشتہ دس برس کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا کے فن کی مختلف جہات پر وقتاً فوقتاً تحریر کیے گئے ہیں جب مجھے انہیں یکجا کرنے کا خیال آیا تب اندازہ ہوا کہ یہ بکھرے ہوئے مضامین الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان سے علم وفن کے کسی سطح کا سہی، ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ایک واضح تاثر سامنے آتا ہے۔''(۵۰)

اس کتاب میں حیدر قریشی نے مختلف حیثیتوں سے ڈاکٹر وزیر آغا کو متعارف کرایا۔ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کے تمام جہتوں کو ایک کتاب میں یکجا کر کے اردو ادب کے قدردانوں کے لیے ایک دلچسپ اضافہ کیا ہے۔یہ کتاب کل ۱۴ مضامین پر مشتمل ہے۔ان تمام مضامین کے ذریعہ حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی فنی، ادبی، تنقیدی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کو لکھنے کا حیدر قریشی کا مقصد ڈاکٹر وزیر آغا کی اہمیت منوانا ہرگز نہیں تھا۔اس حوالے سے حیدر قریشی لکھتے ہیں''میری اس کتاب کا مقصد وزیر آغا کو منوانا نہیں ہے، کیونکہ وہ ماننے اور منوانے کی سطح سے بہت اوپر ہیں۔اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو لوگ ڈاکٹر وزیر آغا سے واقف نہیں ہیں وہ ان سے ملاقات کر سکیں اور جو پہلے سے واقف ہیں وہ ایک نئی ملاقات کر سکیں۔'' (۵۱) حیدر قریشی نے کتاب کا دیباچہ ''ابتدائیہ'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔''ابتدائیہ میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک بڑے ادیب کا درجہ دینے کے ساتھ ان کے مخالفوں کی درجہ بندی کچھ اس طرح سے کی ہے۔

ہر بڑے اور اچھے ادیب کی طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین بھی بے شمار ہیں۔مخالفت کرنے والا ایک طبقہ ایسا ہے جو فکری طور پر ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس اختلاف کا ادبی سطح پر اظہار کرتا ہے۔ایسا اختلاف ادب کے ارتقا کے لیے مفید ہوتا ہے سو ان سے ادبی ڈائیلاگ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔دوسرا طبقہ ان مخالفین کا ہے جو حسد اور ذاتی رنجش کے

..............................

۵۰۔ حیدر قریشی، وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت، خان پور: نایاب پبلی کیشنز:۱۹۹۵،ص،۸۔
۵۱۔ ایضاً،ص،۱۲۱۔

مارے ہوئے ہیں۔(۵۲)

مضمون ''عہدِ ساز شخصیت'' میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجربات کا بیان کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کی قلمی ملاقات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' پر اپنے تنقیدی مضمون میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی کی بہت سی نامعلوم باتوں کو قاری کے سامنے پیش کیا۔حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''شام کی منڈیر سے'' ادب کے ان قارئین کے لیے گائڈ بک کا کام بھی دیتی ہے جنہیں عام طور پر یہ شکایت ہے کہ وزیر آغا کی شاعری انھیں سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے اگر ایسے قارئین ایمان داری سے ''شام کی منڈیر سے'' پڑھ لیں تو ان کی عدم تفہیم کی شکایت نہ صرف دور ہو جائے گی بلکہ انہیں وزیر آغا کے تصورات کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔(۵۳)

''شام کی منڈیر سے'' کا مطالعہ کرنے کے بعد حیدر قریشی روحانی سطح پر خود کے اندر تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔اپنی اُس کیفیت کے متعلق حیدر قریشی لکھتے ہیں:

اس کتاب کے مطالعہ نے نہ صرف نئی سائنسی معلومات کے باعث مجھے بارہا حیرت ومسرت سے دوچار کیا ہے، بلکہ روحانی سطح پر بھی میرے اندر ایک تبدیلی پیدا کی ہے۔میرے الہیاتی تصورات میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی اور پھر ایک نئی تعمیر کا عمل بھی جاری ہوا ہے۔(۵۴)

مضمون '' دو نظموں کا مطالعہ'' میں حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی دو نظموں '' آدھی صدی کے بعد اور'' اک کتھا انوکھی'' کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا۔'' آدھی صدی کے بعد'' ڈاکٹر وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جو کہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی جبکہ ''ایک کتھا انوکھی'' منظوم جگ بیتی ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔حیدر قریشی لکھتے ہیں:

دونوں نظمیں وزیر آغا کی بہترین ہی نہیں جدید ادب کی اعلیٰ ترین خوبصورت ترین نظمیں ہیں۔'' آدھی صدی کے بعد'' نے نو سال کے عرصہ میں جدید نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔''اک کتھا انوکھی'' بھی جدید نظم نگاروں کی ایک نسل کو متاثر کرے گی اور نظم نگاری میں مزید تبدیلیاں پیدا کرے گی۔(۵۵)

.........................

۵۲۔ حیدر قریشی، وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت، خان پور: نایاب پبلی کیشنز ۱۹۹۵ء، ص،۱۱۔
۵۳۔ ایضاً،ص،۲۹۔
۵۴۔ ایضاً،ص،۳۱۔
۵۵۔ ایضاً،ص،۷۰۔

۱۹۴۶ء۱۹۹۰ءتک کے ڈاکٹر وزیرآغا کے شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' جو۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا حیدر قریشی نے اس شعری کلیات میں شامل نظموں کا فنی اور فکری تجزیہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر وزیرآغا کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔اس کے علاوہ ''اردو انشائیہ اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری''، ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ'' اور''ڈاکٹر وزیرآغا ایک مطالعہ'' اپنے آپ میں مکمل مضامین ہیں۔بے شک ڈاکٹر وزیرآغا اردو ادب کا ایک مسلّم نام ہے۔ان کی تحریروں نے ان کی زندگی میں انہیں منفرد مقام عطا کیا۔اردو ادب کی تاریخ میں عرصہ دراز کے لیے ان کا نام محفوظ ہو گیا ہے۔ان کی ذہانت لوگوں کو چونکانے ،متاثر کرنے اور اختلاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہی ایک حقیقی ادیب کا کام ہے کہ وہ ہر حال میں ادب کے فروغ کا ذریعہ بنے۔ بالآخر حیدر قریشی کی یہ کتاب وزیرآغا سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے۔اور اپنے مخصوص تنقیدی انداز کے بدولت ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

## حاصل مطالعہ:

حاصل مطالعہ میں شامل مضامین حیدر قریشی کے ۲۵ سالہ ادبی زندگی میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین کسی شعری، افسانوی مجموعہ ناول یا کسی اور کتاب کے مطالعہ پر مبنی ہے۔حیدر قریشی نے جو کچھ ادبی حوالے سے پڑھا ان میں سے کچھ پر اپنے خیالات کو تبصرہ اور تاثرات کی شکل میں پیش کر دیا۔حیدر قریشی لکھتے ہیں :

> اپنی ادبی زندگی کے دوران تخلیقی کام کے ساتھ میں نے بہت سارے مضامین لکھے ۔ ماہیے کی تحقیق وتنقید کے سلسلہ میں میری پانچ کتابوں کو چھوڑ کر باقی مضامین زیادہ تر کسی شعری، افسانوی مجموعہ، ناول یا کسی اور ادبی کتاب کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ چند مضامین مختلف حوالوں سے ادبی صورتحال کے بارے میں بھی لکھے گئے ۔پچیس سال کے عرصہ پر محیط ان سارے بکھرے ہوئے مضامین کو جمع کرنے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی ۔میرا اندازہ ہے کہ ابھی کم از کم دس پندرہ مضامین مزید ایسے ہیں جو دستیاب نہیں ہو سکے۔تلاش کے بعد ان مضامین اور بعد میں لکھے جانے والے مضامین سے ایک اور مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔تاہم فی الحال جو مضامین مل سکے ہیں مضامین کے اس مجموعہ میں شامل کر دیئے ہیں۔(۵۶)

ادب میں سیاست کا دخل اس حد تک ہو رہا ہے کہ تنقید کا میدان بھی اس سے خالی نہیں۔سکہ بند نقادوں کی اس بھیڑ

..............................................

۵۶۔ حیدر قریشی، حاصل مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۸ء،ص،۹۔

سے بچنے کے لئے حیدر قریشی خود کو تخلیق کار کہلوانا پسند کرتے ہیں، جو کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت پر صادق آتا ہے۔اردو زبان و ادب کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے حیدر قریشی کا خیال ہے کی جب تک اردو لکھنے، بولنے والے موجود ہیں اردو ایک زبان کی حیثیت سے موجود رہے گی۔اردو زبان و ادب کی موجودہ صورتِ حال پر انہوں نے چار اہم مضامین لکھے۔جن کے عنوان درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ ایک صدی کا قصہ

۲۔اردو زبان اور ادب کے چند مسائل

۳۔ تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر

۴۔ یوروپی مما لک میں اردو شعر و ادب کا ایک جائزہ

ان مضامین میں حیدر قریشی نے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، عرب مما لک، مغربی مما لک اور باقی مما لک میں اردو کی صورتِ حال پر نظر ثانی کی ہے۔حیدر قریشی موجودہ عہد میں مغربی مما لک میں اردو کی صورتِ حال سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ مغربی مما لک میں موجود جعلی ادباء کے حوالے سے گفتگو کی۔ بہ قول حیدر قریشی ہجرت یا جنس مغرب کے اردو ادیبوں کا اہم موضوع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں ان موضوعات پر کسی اعلیٰ تخلیق کے نمونے نہیں ملتے۔حیدر قریشی رقم طراز ہیں:

> یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترکِ وطن ہے۔اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس پایے کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں، مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار اس سطح کو مس بھی نہیں کر سکتے۔شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کیے تھے۔سب دکھی تھے جب کہ مغرب میں آ بسنے والے وطن سے زیادہ آرام کی دنیا میں آتے ہیں یہاں کا کھلا ماحول انھیں شاید ان کیفیات سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا جو تخلیقی کرب کا لازمہ ہے۔(۵۷)

زیرِ نظر کتاب کے بیشتر مضامین تاثراتی، تبصراتی یا شخصی نوعیت کے ہیں۔اس کتاب میں حیدر قریشی نے کئی معاصر ناولوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔جن میں نادید، پارپرے (جوگیندر پال)، کئی چاند تھے سرِ آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی)، ایک دن بیت گیا (صلاح الدین پرویز) مورتی (ترنم ریاض) سفر جاری ہے (ثریا شہاب) شامل ہے۔

---

۵۷۔عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد، شمارہ:۱۱، مئی ۲۰۱۰ص، ۴۷۔

حیدرقریشی کی کتاب ''حاصل مطالعہ'' کے بارے میں منشا یاد کا خیال ہے:

''حاصل مطالعہ'' شعر و ادب کی تنقیدی، علمی و ادبی معاملات پر مکالمہ اورمختلف کتب و رسائل پر تبصرہ کا ایک گلدستہ سا بن گئی ہے۔سپیشلائزیشن کے اس دور میں کسی ایک شخص میں اتنی بہت سی خوبیاں اور صلاحیتیں جمع ہو جانا غیر معمولی بات ہے۔اور پھر انہوں نے ہر صنفِ ادب سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔انہوں نے بہت اچھے اور یادگار افسانے لکھے،خوبصورت شاعری کی اور ماہیے کی صنف ادب سے رغبت تو ان کا اختصاص ہے۔(۵۸)

## تاثرات:

زیرِ نظر کتاب ''حاصل مطالعہ'' کے بعد منظر عام پر آئی۔حیدر قریشی نے اس کتاب میں اپنے لکھے ہوئے وہ مضامین اور تبصرے شامل کئے ہیں جو یا تو ''حاصل مطالعہ'' کا حصہ نہ بن سکے یا پھر حاصل مطالعہ کی اشاعت کے بعد لکھے گئے۔اس کتاب میں کچھ ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن کے ابتدائی نقوش 'حاصل مطالعہ'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔اس طرح سے دیکھا جائے تو حیدر قریشی نے اُن مضامین کو مکمل وضاحت کے ساتھ ''تاثرات'' میں شامل کیا۔ان مضامین کے عنوان اس طرح ہیں:''مغربی ممالک میں اردو ادب کی صورت حال''، یورپ کی نو آباد اردو بستیوں میں اردو کا مستقبل''،مغربی ممالک میں ارود کی صورت حال''۔اس بارے میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''حاصل مطالعہ'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک جو نئے مضامین اور تبصرے لکھے گئے ان سب کو یکجا کیا تو اندازہ ہوا کہ مضامین کا ایک نیا مجموعہ تیار ہوگیا ہے۔مغربی دنیا میں اردو کی نئی بستیوں کے بارے میں ۱۹۹۹ء سے اب تک میں اپنے موقف پر قائم ہوں۔اس سلسلے میں ''حاصل مطالعہ'' کے بعض مضامین میں جو کچھ لکھ چکا ہوں، وہی کافی تھا لیکن اس دور ان تین مختلف اوقات میں کی گئی تین فرمائشوں پر مجھے اسی موقف کو تین مضامین میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرنا پڑا۔
(۵۹)

حیدر قریشی نے کلکتہ کے روزنامہ ''عکاس'' کے لیے مضمون ''مغربی ممالک میں اردو ادب کی صورت حال'' تحریر کیا۔انگلینڈ کی ایک تقریب کے لیے مضمون ''یورپ کی نو آباد اردو بستیوں میں اردو کا مستقبل'' اور''،مغربی ممالک میں ارود کی صورت حال''، مضمون اٹلی کے ایک سیمینار کے لیے قلم بند کیا۔

زیر نظر کتاب میں شامل باقی مضامین کسی خاص منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھے گئے بلکہ بیشتر مضامین جدید

............................................

۵۸۔ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد،شمارہ:۱۱۔مئی ۲۰۱۰،ص،۴۲۔

۵۹۔ حیدر قریشی،تاثرات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۲،ص،۹۔

ادب کے لیے موصولہ کتب پر مضامین اور تبصرے کی شکل میں موجود ہیں۔

## گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت:

یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔اس کتاب میں حیدرقریشی نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں سے متعلق ان تمام مضامین کو یکجا کر کے پیش کیا ہے جو اس موضوع سے وابستہ ہیں۔ایسا کرنے کا ان کا مقصد قارئین کو سچ سے آگاہ کرنا تھا۔زیرِ نظر کتاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب''ساختیات ، پس ساختیات اورمشرقی شعریات'' سرقوں کا مجموعہ ہے۔حیدرقریشی کے الفاظ میں:

> ''نارنگ صاحب کی تصنیف''ساختیات،پس ساختیات اورمشرقی شعریات'' اردوادب کی تاریخ کا سب سے بڑا سرقہ ہے۔یہ کسی شعر کے توارد، کسی غزل یا نظم کے مضامین مل جانے کی بات نہیں۔کسی اکادکا نثری اقتباس سے فیضیاب ہونے والی جیسی صورت نہیں۔یہ بڑے سوچے سمجھے انداز میں اور بڑی کاری گری کے ساتھ کیا گیا بہت بڑا علمی و ادبی ڈاکہ ہے۔''(۶۰)

زیرنظر کتاب میں جدید ادب کے شمارہ نمبر۱۲ کی کہانی، عکاس انٹرنیشنل کا ڈاکٹر نارنگ نمبر،انٹرنیٹ پر ایک اوپن مکالمہ (نصرت ظہیر)،سرقوں کے دفاع کی مہم،اتفاقیہ یا منصوبہ بند کاروائی؟،ساختیات کے حوالے سے ایک پرانا خط جیسے موضوعات پیش کئے گئے ہیں۔ان کے علاوہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے حیدرقریشی کی کیا سوچ ہے اور مابعد جدیدیت کی عالمی صورت حال پر ڈاکٹر وزیر آغا اور ناصر عباس نیر کا کیا ردِعمل رہا اسے بھی پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کی جھلک تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

## اردو میں ماہیا نگاری:

ماہیے کے حوالے سے حیدرقریشی کا کام بہت بڑا اور اپنے آپ میں وسعت لیے ہوئے ہے۔حیدر قریشی کی تنقیدی وتحقیقی تصنیف''اردو میں ماہیا نگاری'' ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ کتاب ۱۹۹۶ میں مکمل ہوئی اور ۱۹۹۷ء میں فریاد پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوئی۔کتاب کا انتساب ملاحظہ ہو:''قمر جلا ل آبادی اور ساحر لدھیانوی کے نام جنھوں نے اردو میں درست ماہیا نگاری کی مثالی نمونے عطا کیے اور خوبصورت گلوکاروں محمد

---

۶۰۔ حیدرقریشی،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ارو مابعد جدیدیت،جرمنی: سرور ادبی اکادمی،۲۰۰۹،ص،۱۰۔
۶۱۔ ایضاً،ص،۱۳۔

رفیع، آشا بھونسلے اور مسرت نذیر کے نام جن کے گائے ہوئے ماہیے، ماہیا نگاری کی بحث میں مستقل حوالہ بن گئے ہیں۔ (۶۲)

۱۹۹۰ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک ماہیے کے حوالے سے چلنے والی بحثوں کو اپنے تاثرات کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا۔ حیدر قریشی لکھتے ہیں۔

''اس کی بیشتر روداد میں نے اپنے تاثرات کے ساتھ اس کتاب میں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوشش کا لفظ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ۱۹۹۲ء میں جب ماہیے پر پہلا تنقیدی مضمون شائع ہوا، انہیں ایام میں مجھے ترک وطن کرنا پڑا۔ برون ملک آکر شاید میں تمام رسائل پر پوری نظر نہیں رکھ سکا۔ ماہیے کی بحث جب عروج پر پہنچی میں وطن عزیز سے دور تھا اس کے باوجود مقدور بھر اس کی بحث میں شریک رہا۔'' (۶۳)

حیدر قریشی کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحقیق کا دعویٰ کرتے ہوئے سامنے والے کو پورے اعتماد کے ساتھ متوجہ کرتے ہیں۔ بقول حیدر قریشی ''میں ادب میں کسی قول اور نظریہ کو حرف آخر نہیں سمجھتا۔ ماہیے کے سلسلے میں میرا ایک موقف ہے جسے میں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان دلائل کو ان سے بہتر دلائل کے ساتھ توڑا جا سکتا ہے لیکن پتھر کے ساتھ نہیں۔'' (۶۴)

ماہیے کے حوالے سے حیدر قریشی کا پہلا مضمون ۱۹۹۲ دسمبر میں شائع ہوا۔ ماہیے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ماہیے کو پنجابی لوک گیت کا نام دیا۔ ماہیے کا لفظ ماہی سے نکلا جو کہ محبوب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حیدر قریشی ماہیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ماہیے میں پنجاب کے عوام کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا خوبصورت اور براہ راست اظہار ملتا ہے۔ عوام نے اپنی امنگوں، آرزؤں اور دعاؤں کو اس شاعری کے ذریعے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا اور زندہ رکھا۔ اسی لیے یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہونے کے باوجود اپنی سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔'' (۶۵)

زیر نظر کتاب میں ماہیے کے وزن کا مسئلہ، اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا، اردو ماہیے کے موضوعات اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ماہیے کے وزن کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''جب

---

۶۲۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا تحقیق و تنقید، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰، ص، ۲۵۔
۶۳۔ ایضاً، ص، ۲۵۔
۶۴۔ ایضاً، ص، ۲۵۔
۶۵۔ ایضاً، ص، ۲۷۔

ماہیے کوتحریری صورت میں دیکھنے کے باعث اس کے دوسرے مصرے کے وزن کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے تو کسی درست نتیجے تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟۔۔۔اس سلسلے میں میرا مؤقف یہ ہے کہ ماہیا اصلاً لوک گیت ہے جس کی اپنی دھن ہے۔بس اسی دھن میں ہی اس کا اصل وزن موجود ہے۔'' (۶۶) انہی دھنوں کو بنیاد بنا کر آگے لکھتے ہیں'' ماہیے کا پہلا مصرع اور تیسرا مصرع ہم وزن ہوتے ہیں لیکن دوسرا مصرع ان کے وزن سے ایک سبب یعنی دو حرف کم ہوتا ہے۔'' (۶۷)

مذکورہ کتاب میں حیدرقریشی اپنے مضمون'' اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا'' میں چراغ حسن حسرت اور قمر جلال آبادی کے ماہیوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔'' چراغ حسن حسرت ۔۔نے ۱۹۳۷ء میں پنجابی ماہیے کے حسن سے متاثر ہوکر اردو میں چند ماہیے کہے۔۔پنجابی ماہیے کی جادوگری اور چراغ حسن حسرت کی ماہیے سے محبت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن حسرت پنجابی ماہیے کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ سکے۔'' (۶۸) کتاب کے آخر میں ''خصوصی مطالعہ'' میں چند ماہیا نگارون کے فن پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

## اردو میں ماہیے کی تحریک:

مذکورہ کتاب حیدرقریشی کے تنقیدی مضامین اور خطوط پر مبنی کتاب ہے جو فرہاد پبلیشنز راول پنڈی سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔کتاب کا انتساب ہمت رائے شرما کے نام کیا گیا ہے۔حیدرقریشی کتاب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اردو میں ماہیا نگاری یک موضوعی کتاب تھی۔اسے لکھتے وقت میں ۱۹۹۴ء کے پائدان پر کھڑا ہوکر گزشتہ چھ برسوں کی بحث کا منظر دیکھ رہا تھا۔جبکہ'' اردو ماہیے کی تحریک'' میں مضامین فاصلے سے منظر کو دیکھانے کے بجائے لمحہ لمحہ کی کہانی سناتے ہیں۔ماہیے کی بحث کے ریکارڈ کی درستی کے لیے چند اہم خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ان مضامین اور خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماہیے کو سمجھنے کے عمل میں بتدریج بہتری آتی گئی ہے۔(۶۹)

..............................

۶۶۔ ص ۲۸۔
۶۷۔ ص ۲۹۔
۶۸۔ قریشی،حیدر،اردو ماہیا تحقیق وتنقید،لاہور:الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۰ص،۳۱
۶۹۔ ایضاً،ص،۳۳

ماہیے کے دوسرا مصرعہ، ماہیے کے وزن، اردو ماہیا کل اور آج، ماہیے کی کہانی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، اردو ماہیے کی تحریک جیسے موضوعات اس کتاب میں شامل ہیں۔خط بنام ایڈیٹر ''تجدید نو'' (لاہور) خط بنام ایڈیٹر ماہنامہ ''صریر'' (کراچی) بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔

## اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما:

۷۲ صفحات پر مبنی یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں معیار پبلی کیشنز، دہلی سے شائع ہوئی۔کتاب کے پیش لفظ میں حیدر قریشی نے اردو ماہیے کے بانی سے متعلق اپنی ابھی تک کی تحقیق کو لے کر مدلل بحث کرتے ہوئے ہمت رائے شرام کو اردو ماہیے کا بانی قرار دیتے ہیں۔اردو ماہیے کے بانی کے حوالے سے حیدر قریشی کی سابقہ تحقیق۔''یہ ماہیے اردو کے سب سے پہلے ماہیے ہیں جو پنجابی ماہیے کے وزن پر پورے اترتے ہیں۔اس لحاظ سے قمر جلا آبادی اردو کے سب سے پہلے ماہیا نگار قرار پاتے ہیں۔'' (۷۰)

> اردو ماہیے کی تحریک ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے۔کل تک ہم سمجھتے رہے تھے کہ صرف فلم ''پھاگن'' اور نیا دور'' میں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی نے اردو ماہیے لکھے تھے لیکن اب تک یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ ان سے پہلے ہمت رائے شرما اور قتیل شفائی نے فلم ''خاموشی'' اور فلم ''حسرت'' (پاکستان) میں اردو ماہیے پیش کئے تھے۔اب تک سات فلموں میں گائے گئے اردو ماہیے دریافت ہو چکے ہیں اور لوک فنکار عطاء اللہ خان نیازی عیسیٰ خیلوی کے (پرئیویٹ) گائے اردو ماہیے بھی سامنے آچکے ہیں۔(۷۱)

اردو میں ماہیا کے بانی کے حوالے سے اپنے پہلے مضمون ''اردو میں ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' میں حیدر قریشی نے کہا کہ ہمت رائے شرما نے درست وزن کے ساتھ اردو ماہیے سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں کہے۔اپنے اس قول کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں کی:

> میں نے ہمت رائے شرما جی کے بارے میں اپنے پہلے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ ہمت رائے شرما جی نے درست وزن کے اردو ماہیے سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں کہے تھے اس لئے انہیں ابھی تک کے ماہیے کے بانی قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی پر اولیت حاصل ہے۔اسی طرح میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''تحقیقی اور تاریخی لحاظ سے انہیں چراغ حسن حسرت

---

۷۰۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا تحقیق و تنقید، لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء، ص،۴۱۔
۷۱۔ ایضاً، ص،۵۳۳۔

کے ثلاثی گیت پر بھی اولیت اور فوقیت حاصل ہے''۔اس سلسلے میں میرے پیش نظر دو اہم باتیں تھیں۔ ا۔ چراغ حسن حسرت کے ثلاثی قسم کے''ماہیے'' پیش کرنے والوں نے ان کا سال اشاعت ۱۹۳۷ء بتایا تھا جو ۱۹۳۶ء کے بعد آتا ہے۔ ۲۔ پروفیسر آل احمد سرور نے''کوہسار جرنل'' کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۷ء میں حسرت کے مبینہ ماہیوں کو نظم قرار دیتے ہوئے حمید نسیم کی خودنوشت''ناممکن کی جستجو'' کا حوالہ دیا تھا۔چونکہ مجھے جرمنی میں حمید نسیم کی کتاب دستیاب نہ تھی اس لیے میں نے پروفیسر آل احمد سرور کے بیان پر انحصار کرلیا۔لیکن مضمون کی اشاعت کے بعد اب مجھے''ناممکن کی جستجو'' کے متعلقہ صفحات ملے ہیں تو اندازہ ہوا کہ آل احمد سرور صاحب کو سہو ہوا تھا۔کیونکہ حمید نسیم نے اس میں''حسرت'' کے ثلاثی قسم کے گیت کو ماہیا ہی لکھا ہے۔مزید یہ کہ حمید نسیم کی یادداشت کے مطابق حسرت نے جنوری ۱۹۳۶ء میں مذکورہ''ماہیے'' ایک مشاعرہ میں سنائے تھے۔(۷۲)

اس مدلل بحث کے بعد حیدر قریشی کے مضمون''اردو ماہیے کے بانی: ہمت رائے شرما'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

ابھی تک کی تحقیق کے مطابق قمر جلال آبادی اردو ماہیے کے بانی تھے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تازہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ہمت رائے شرما جی اردو ماہیے کے بانی ہیں۔سہ ماہی''کوہسار جرنل'' بھاگل پور شمارہ اگست ۱۹۹۷ء میں انہوں نے اپنی تحقیقی کاوش''اردو ماہیا کی روایت سے متعلق ہمت رائے شرما کی وضاحت'' کے زیر عنوان پیش کی ہے۔ (۷۳)

اسی مضمون میں آگے چل حیدر قریشی نے مناظر عاشق ہرگانوی کی ماہیا تحقیق کے بعد جو ردِعمل سامنے آیا اسے رقم کیا ہے۔اردو ماہیے کے بانی کے حوالے سے مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق ہے کہ''اردو ماہیے کے بنیادگزاروں میں ابھی تک کی تحقیق کے مطابق چراغ حسن حسرت، ساحر لدھیانوی اور قمر جلال آبادی کے نام آتے رہے ہیں لیکن میری حالیہ تحقیق یہ ہے کہ اولیت کا سہرا ہمت رائے شرما کے سر ہے۔(۷۴) حیدر قریشی نے حسرت، محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، سیدہ حنا اور دیپک قمر وغیرہ کو اس وقت کی ماہیا تحریک کے بنیادگزاروں میں شامل کیا ہے۔لکھتے ہیں''۔۔۔۔۔تاہم حسرت سے لے کر دیپک قمر تک ان سارے''بنیادگزاروں'' کا ماہیا کے لئے اتنا ہی کردار ہے کہ انہوں نے ماہیا نما ثلاثی لکھ کر اصل ماہیے کے لیے راہ ہموار کردی۔''(۷۵)

..............................................

۷۲۔ حیدر قریشی، ماہیا تحقیق و تنقید، لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء،ص ۵۳۳-۶۳۳۔
۷۳۔ ایضاً،ص،۳۳۹۔
۷۴۔ ایضاً،ص ۳۴۰۔
۷۵۔ ایضاً،ص ۱۳۴۔

حیدرقریشی نے اپنے تین مضامین بہ عنوان ''اردو ماہیے کا بانی ہمت رائے شرما'' مطبوعہ ''انشا'' (کلکتہ)، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۸ء، ''اوراق'' (لاہور) جنوری، فروری: ۱۹۹۸ء اور ''جدید ادب'' (جرمنی) شمارہ: ا مئی ۱۹۹۹ء میں یہ دعویٰ کیا کہ ہمت رائے شرما اردو کے پہلے ماہیا نگار شاعر ہیں۔اس لیے کہ ہمت رائے شرما نے فلم ڈائریکٹر آر۔سی۔تلواڑ کی مئی ۱۹۳۶ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''خاموشی'' کے لیے ماہیے لکھے۔حیدرقریشی نے ہمت رائے شرما کی جانب سے فراہم کردہ کتابچہ لیٹ کا عکس دیکھ کر اپنے تینوں مضامین میں بُک لیٹ سے متعلق جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

سرورق پر ہیروئن رمولا کی تصویر ہے۔دائیں طرف اوپر انگریزی میں درمیان میں ہندی میں اور نیچے اردو میں فلم کا نام خاموشی لکھا ہوا ہے اور آخر میں صرف انگریزی میں ڈائریکٹر آر۔سی۔تلوار کا نام لکھا ہوا ہے۔سرورق کے اندر کی طرف فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر، کاسٹ اور اہم ٹیکنشنز وغیرہ کا نام درج ہے۔یہ سارے نام انگریزی میں لکھے ہیں۔پروڈیو سرایل۔آر۔ پرشر ہیں (ایل آر= لاہوری) ''پروڈیوسر انڈر دی بینز آف تلوار پروڈکشنز (انڈر نیو مینجمنٹ) مئی ۱۹۳۶ء'' درج ہے ۔ انگریزی کے اصل الفاظ ہی یہاں پر درج کردیا ہوں : (۷۶)

Producer under the banner of......TALWAR PRODUCTIONS

( under new managment ) may ,1936

وہیں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس تحقیق کو رد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'' سکرین پلے اور ڈائیلاگ امتیاز علی تاج ، گیت کار ہمت رائے ،موسیقار جی۔اے۔چشتی آرٹ ڈاریکٹر ہمت رائے اور اداکاروں کی لسٹ میں یہ نام شامل ہیں۔رمولا (ہیروئن) کلیانی، رام دلاری ،شیام (ہیرو) سندرسنکھ، گاما، لیلیٰ مشرا، امرناتھ پاسان ،منورما، نندکشور، ہمت رائے وغیرہ۔(۷۷) اس کتابچہ کے حوالے سے ہمت رائے شرما کا دعویٰ ہے کہ درج ذیل اردو ماہیے انہوں نے فلم ''خاموشی'' کے لیے ۱۹۳۶ء میں کہے تھے۔جو فلم کے لئے عکس بند بھی کئے گئے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا یہ مضمون پڑھ کر ''جدید ادب'' (جرمنی) کے اُسی شمارے (شمارہ:۲،مئی ۲۰۰۰ء) میں

..............................

۷۶۔ حیدرقریشی، اردو ماہیا تحقیق وتنقید، لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۰، ص،۳۲۵۔

۷۷۔ جدید ادب، (جرمنی)، شمارہ: ا (مئی ۱۹۹۹) ص،۳۱۔

حیدرقریشی نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا۔

ماہیے کی بحث شروع ہونے سے کئی سال پہلے۱۹۸۴ء میں ہمّت رائے شرما جی کا شعری مجموعہ ’’شہاب ثاقب‘‘ شائع ہوا تھا۔اس میں شرما جی کے وہی دس ماہیے شامل ہیں جوفلم خاموشی سے منسوب ہیں۔۔۔۔اُس زمانے میں بہت ہی کم عمر کی لڑکیاں فلموں میں آتی رہیں ہیں۔مثلاً مشہور فلمی ویمپ للیتا پوار جو شروع میں ہیروئن آئیں ،گیارہ برس کی عمر میں فلموں میں آئیں۔معروف گلوکارہ اور ہیروئن ثریا،کلیانی (اصل نام زرینہ)پروڈیوسر ولی کی بیوی اور اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن ممتا شانتی یہ نام تو مجھے فوراً یاد آ گئے یہ سب گیارہ برس کی عمر میں فلموں میں آ گئیں تھیں۔(۷۸)

علاوہ ازیں مضمون’’میاں آزاد کا سفر نامہ‘‘ ، ہمت رائے شرما کی شاعری۔ایک تعارف‘‘ خاص نوعیت کے ہیں۔مذکورہ کتاب میں ہمت رائے شرما کی دو کتابوں’’ہندو مسلمان‘‘اور’’نکات زباندانی‘‘پر بھی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ماہیے کی یہ بحث علمی ،ادبی اور تحقیقی ہے۔ماہیا کو لے کر ہونے والی تمام بحث میں حیدرقریشی کا مقام تعین کرنا تحقیق کا ایک الگ پہلو ہے۔حیدرقریشی کی اردو ماہیا سے وابستگی قابل ذکر ہے۔

## کالم نگاری:

کالم سے مراد ایک ایسی مختصر مگر جامع تحریر ہے جو باقاعدہ عنوان کے تحت مختلف موضوعات پر کسی روزنامہ، جریدے یا ہفت روزہ میں شائع ہو۔اس تحریر میں خاص اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جو کالم کے مزاج اور نوعیت کے اعتبار سے سنجیدہ ہوتا ہے۔موجودہ دور میں کالم نویسی کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔کالم میں مختلف معاشرتی ،سماجی، اقتصادہ یا ادبی مسائل پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے اسی بنا پر آج کا قاری ذرائع ابلاغ کی نقد ونظر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بنا پراس سے ایسے مواد کا طلبگار رہے جو نہ صرف نئ سے نئ معلومات فراہم کرنے کا باعث بنے بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان میں پوشیدہ مفاہیم کی سمجھ بوجھ میں اس کی مدد کرے۔کالموں کے ذریعہ مسائل کا حل ہی نہیں پیش کیا جاتا بلکہ مختلف سیاسی برائیوں کا نشاندہی کے ساتھ ساتھ قارئین کی ذہنی تفریح بھی مہیا کی جاتی ہے۔کالم کی موضوعاتی اقسام میں طبی ،قانونی ،ذہنی ،نفسیاتی ،معاشی اور کھیلوں کے کالم ہیں۔اسلوب کے حوالے سے کالموں کو فکاہیہ، سنجیدہ ،علامتی ، ترکیبی یا مکتوبی کالم میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔جبکہ شہرنامی یا سیاسی کالم مشاہداتی کالم نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔

.......................................

۷۸۔ ’’جدید ادب‘‘ ،جرمنی ،شمارہ:۲،مئی ۲۰۰۰ ،ص:۴۶ ،۴۵۔

حیدر قریشی کثیر الجہت ادبی شخصیت کے حامل ہیں ۔ جہاں انہوں نے شاعری،افسانہ نگاری ،تنقید نگاری وغیرہ کے میدان میں اپنے کمالات دیکھائے وہاں کالم نگاری کے فن میں بھی ان کی مہارت صاف نظر آتی ہے۔حیدر قریشی کی ادبی کالم نگاری کا آغاز امریکہ میں ہوئے ۹/۱۱ کے حادثہ سے ہوا۔اس حادثہ کے بعد دنیا بھر میں جوتبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے متاثر ہوکر حیدر قریشی نے کالم نویسی کا رُخ کیا۔۱۵/اپریل۲۰۰۲ سے لے کر ۱۸/ نومبر۲۰۰۳ کے درمیان لکھے گئے ۲۵ کالم وقتاً فوقتاً urdustan.com پر شائع ہوتے رہے ہیں۔۲۰۰۴ء میں حیدر قریشی نے ان تمام کالموں کو''منظر اور پس منظر'' کے عنوان کے تحت سرور ادبی اکادمی جرمنی اور اردوستان ڈاٹ کام امریکہ کے زیر اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا کالموں کے مجموعے''منظر اور پس منظر'' کے ابتدایئے میں حیدر قریشی اپنی کالم نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں :

''گیارہ ستمبر۲۰۰۱ء کے بعد

عالمی سیاسی اخلاقیات اوراصولوں کی دنیا کا نقشہ جس سرعت کے ساتھ تبدیل ہوا،

اس پر باقی دنیا کی طرح میں بھی عجب سے دکھ اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

شاعری یا کہانی کی صورت میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو جو کچھ لکھا گیا وہ میرے نزدیک صحافتی سطح کی شاعری اوراسی طرح کے افسانے بنتے تھے۔

میں نے دو نظمیں اور تین افسانے لکھ تو لیے لیکن میری ان نظموں اور کہانیوں نے ہی مجھے روک لیا۔

صحافت کا اپنا ایک جہان ہے، جو ادب سے قربت رکھنے کے باوجود بالکل الگ جہان ہے۔

میں ادب اور صحافت میں پیش کش کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔

اسی لیے صحافیانہ انداز میں کہانیاں لکھنے والوں کی طرح اپنی کہانیاں پیش کر کے میں اس موضوع،اس انسانی اور عالمی سیاسی المیہ پر اپنے جذبات کا پورے طور پر اظہار نہیں کر پاتا۔

بے شک بعض بڑے افسانہ نگاروں نے بعض ہنگامی موضوعات کو مس کر کے بھی بڑی بڑی کہانیاں لکھی ہیں لیکن میری لکھی کہانیاں مجھے ادبی تقاضوں سے ہٹ کر سطحی ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔چنانچہ ان کہانیوں اور نظموں کے کہنے پر میں نے ان سب کو ضائع کر دیا۔'' (۷۹)

حیدر قریشی نے''منظر اور پس منظر'' کے تحت لکھے کالموں میں متفرق موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔کتاب''خبر نامہ'' حیدر قریشی کے کالموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ۲۱/اپریل۲۰۰۳ سے لے کر ۲۵/ دسمبر۲۰۰۳ تک لکھے

..............................................................

۷۹۔ حیدر قریشی،منظر اور پس منظر، جرمنی: سرور ادبی اکادمی ۲۰۰۴،ص،۷۔

گئے کالم شامل کیے گئے ہیں، جو کہ ۲۰۰۶ میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔اس کتاب میں حیدرقریشی کے زیر مطالعہ آنے والی خبروں کا انتخاب اور ان پر کیے گئے تبصرے شامل ہیں۔''منظر اور پس منظر'' اور'' خبر نامہ'' کے بعد حیدرقریشی نے کالم نگاری ترک کر دی تھی،لیکن اپنے عزیز دوست خورشید اقبال صاحب کے اصرار پر'' ادھراُدھر سے'' کےعنوان سے کالم کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔زیرِنظر کتاب کی فہرست میں حیدرقریشی نے ہر کالم کی تاریخ اشاعت درج کی ہے اور ہر کالم کے آخر میں کالم کے لکھے جانے کی تاریخ درج ہے۔حالاتِ حاضرہ پر حیدرقریشی کی تین کتابیں منظر عام پر آنے کے بعد حیدرقریشی کالم نگاری سے مکمل طور پر رخصت ہونا ہی چاہتے تھے کہ انہیں ایک اہم خیال آیا۔مغربی دنیا کے حوالے سے پاکستانی معاشرے، میں پھیل چکی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ایک با مقصد قدم اُٹھایا جو کہ ۸ مضامین پر مشتمل کتاب'' چھوٹی سی دنیا'' کی صورت میں منظر عام پر آئی۔حیدرقریشی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہم لوگ شترمرغ کی طرح اپنا سر ریت میں دے کر خوش نہ ہوں بلکہ کھلی آنکھوں سے بدلتی ہوئی دنیا کو دیکھیں۔

مختصر یہ کہ حیدرقریشی کے ذہنی ارتقا کے تمام مدارج بتدریج ان کے ادبی کالموں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں حیدرقریشی کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ وہ زمانہ کی قید سے آزاد ہے،وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی تحریر میں زندگی اور شدت کے احساسات نمایاں رہیں گے۔حیدرقریشی کا اندازِ بیان سادگی ،سلاست اور ذہانت کا بہترین امتزاج ہے۔

**افسانہ:**

افسانہ نگاری ادب کی ایک ایسی ہی خاص صنف ہے جو ہماری روزمرہ زندگی کے عمومی رویوں کو خصوصی انداز میں پیش کرتی ہے۔زندگی کی بنتی بگڑتی اقدار، معاشرے میں پھیلی ہوئی مادیت اور بے حسی ،فرد کا فرد سے رابطہ منقطع ہو جانے پر داخلی دنیا کا سفر یہ سب مل کر مختلف نفسیاتی عوامل کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے۔زندگی کی دوڑ میں سارے دن کا تھکا ہارا انسان کسی ایسے مشغلے کی جستجو میں رہتا ہے جو عارضی طور پر ماحول کی تلخیوں کو کم کر دے اور وقتی طور پر وہ رومان کی تخئیلاتی وادی میں گم ہو جائے۔اس کے لیے ادب کی دنیا میں اس کو مطمئن کرنے کے لیے بہت کچھ

ملتا ہے اور اس طرح ایک فرد کا دوسرے فرد سے ربط وضبط کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

یورپ میں مقیم حیدر قریشی عصر حاضر کے باشعور اور حساس اردو افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور جلد ہی اپنی ذہانت اور عمدہ صلاحیت سے بلند مقام حاصل کرلیا۔ان کے پاس افسانہ لکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔وہ انسانی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔حیدر قریشی کے گہرے مشاہدے اور دردمند تخلیقی احساس نے ہمارے سماجی ڈھانچے کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ان کے افسانے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

''روشنی کی بشارت'' (۱۹۹۲)اور'' قصے کہانیاں'' حیدر قریشی کے دو افسانوی مجموعے ہیں۔قصے کہانیاں مجموعہ الگ سے نہیں چھپا بلکہ روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں''افسانے'' کے نام سے ایک جلد میں (۱۹۹۹) شائع ہوا۔''ایٹمی جنگ'' میں حیدر قریشی کے تین افسانے شامل ہیں، جو (۱۹۹۹) میں شائع ہوا۔''میں انتظار کرتا ہوں'' افسانوں کا ہندی ترجمہ ہے۔And i wait سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ ۱۹۹۶ میں شائع ہوا۔آگے کے ابواب میں حیدر قریشی کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

وہ تحریر ہمیشہ پسندیدگی کی سند حاصل کرتی ہے، جو اپنے لکھنے والے کے خیالات ،رجحانات اور تاثرات کو بھرپور انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرے۔حیدر قریشی کی تحریر میں یہ خوبی عمدگی سے موجود ہے۔ان کی شاعری ہو، افسانہ ہو،تنقید یا کالم سب ان کی شخصیت کے غماز ہی نہیں بلکہ ان کے ذہنی اتار چڑھاؤ، ذاتی پسند و ناپسند سب کو قارئین کے سامنے لاتے ہیں اور ان کی تحریر کا بے ساختہ پن ہی اس کی دل آویزی کا بنیادی عنصر ہے۔

# باب۔۳

# حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی جائزہ

موضوع کی اہمیت خام مواد کی ہے۔ایک تخلیق کار اپنی تخلیقات کے ذریعہ جو خیال پیش کرتا ہے وہ موضوع کہلاتا ہے۔اوران موضوعات یا خیالات کو پیش کرنے کے لیے جس نقطہ نظر یا طریقہ کار کو اپنایا جاتا ہے وہ اس افسانہ نگار کا رجحان یا میلان کہلاتا ہے۔موضوع کا دائرہ وسیع اور پھیلا ہوتا ہے۔وقت اور حالات نئے نئے موضوعات کو جنم دیتے ہیں۔ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔موضوعات کے کئی رُخ ہو سکتے ہیں،بعض موضوعات انفرادی نوعیت کے ہو سکتے ہیں تو بعض اجتماعی نوعیت کے۔یہ موضوعات معاشی،مذہبی،تہذیبی،ثقافتی،تاریخی،مابعد الطبیعاتی، ارضی،فلسفیانہ نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔جبر واستحصال،ظلم وزیادتی، دنگے،فساد، جھگڑے، جنگ،خوف، بے چینی، اضطراب، بھوک، بیماری،جنسی تشدد، اخلاق، برہنگی،خوشی،مسرت، امن وسکون،غرض دنیا جہاں کی تمام باتیں موضوعات کے دائرے میں سمٹ آتی ہیں۔اس میں زمان ومکاں دونوں کا دخل ہوتا ہے۔موضوع شہروں اور ملکوں تک نہیں بلکہ کل کائنات کو خود میں سمیٹے ہوتا ہے۔موضوعات وقتی اور ہنگامی ہونے کے ساتھ ساتھ ابدی اور آفاقی بھی ہوتے ہیں۔ان کا تعلق داخل وخارج سے بھی ہے۔غرض یہ کہ موضوعات کی دنیا بہت زیادہ وسیع ہے۔

رجحان ومیلان بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ تحریکیں اٹھتی رہی اور دم توڑتی رہی ہیں نظریات جنم لیتے اور مٹتے رہتے ہیں۔اسی طرح رجحانات بھی بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔رجحان خالص داخلی چیز ہے لیکن اس کی تشکیل میں خارجی حالات وکوائف بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔موضوع اور میلان و رجحان کا رشتہ گہرا ہوتا ہے۔

افسانہ نگار کسی بھی موضوع کا انتخاب اپنے رجحان کے تابع ہو کے کرتا ہے۔اگر اس کی دلچسپی سیاست سے ہے تو وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرے گا جو کہ سیاسی نوعیت کے ہوں۔اگر مذہب کی طرف رغبت ہوگی تو مذہبی موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے گا۔صرف موضوع کے انتخاب تو پہلا مرحلہ ہے اس کے بعد اس موضوع کو سلیقہ کے ساتھ پیش کرنا اہم کام ہے۔پیش کرنے کے لیے افسانہ نگار اسلوب،زبان وبیان،تکنیک وغیرہ کو اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ان تمام باتوں میں افسانہ نگار کا رجحان ومیلان ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔پریم چند نے دیہی زندگی کے مسائل کو اپنا خاص موضوع بنایا۔احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہاتوں کو اپنے افسانوں میں اہمیت دی۔وہیں انتظار حسین نے تقسیم ہند اور ہجرت کو اپنا موضوع بنایا۔دراصل یہ سب کے سب اپنے رجحان کے تابع ہیں۔صرف

موضوعات کی بنا پر عظیم فن پارے کی تشکیل ممکن نہیں۔کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ''کفن''،'' آخری آدمی''، ''پھندنے''،''ٹوبہ ٹیک سنگھ''اور''اپنے دُکھ مجھے دے دو''جیسے افسانے ہر دور میں مقبول ہوتے۔لیکن کسی افسانہ کی عظمت اس کے موضوع پر منحصر نہیں ہوگی بلکہ برتاؤ پر ہے۔درحقیقت افسانے کی عظمت افسانہ نگار کی رہین منت ہے نہ کہ موضوع کی۔اردو افسانہ پر مختلف قسم کے عالمی وقومی اثرات وقتاً فوقتاً مرتب ہوئے۔اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز کسی حد تک مغربی ادب کا مرہونِ منت ہے تاہم اگر اردو کی مختلف داستانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی افسانوی عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔عمومی خیال یہ ہے کہ افسانہ کا نقطہ آغاز پریم چند سے ہوا۔پریم چند نے رومانوی فضا کے ساتھ افسانے کو زندگی کی حقیقت اور دھرتی کی خوشبو سے روشناس کرایا۔مشرق کے مخصوص تہذیبی انداز کو اپنی افسانوی تحریروں میں سمویا۔افسانوی ادب میں سماجی اخلاقیات کو بڑے احسن طریقے سے شامل کرنے کی کوشش کی۔اس طرزِ بیان نے داستان کی خیالی دنیا کی سجاوٹ کے بجائے افسانے میں زمینی حقائق اور معاشرتی تبدیلیوں کو کامیابی سے پیش کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز مہاجرت اور فسادات کے نتیجہ میں ہونے والے واقعات رہے۔اس دور کے افسانہ نگاروں کو گزشتہ ادوار کی سماجی حقیقت نگاری،جنسی مسائل، اشتراکی پروپیگنڈا اور انقلابی نعروں سے کوئی سروکار نہیں رہا بلکہ تازہ موضوعات اور نئے تجربات ہی افسانوں میں شامل کئے گئے۔آزادی کے بعد فسادات اور ہجرت کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ ساتھ اپنوں کے جبر وستم ، بدعنوانیوں اور ناانصافی کی داستانیں اردو افسانہ کا مقبول ترین موضوع بن گئیں۔موضوعات میں اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ فنی رویہ میں تبدیلی یہ ہوئی کہ کرداروں اور ان کے اعمال کی جگہ افسانوں میں نفسیاتی عوامل اور ذہنی کیفیات کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھا جانے لگا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ زندگی کے متنوع تجربات اور جدید سماجی علوم کے مطالعہ نے کردار کے مطالعہ کا ڈھنگ ہی بدل دیا۔ ماحول اور کردار کو شناخت کرنے کے لیے واقعات کی تفصیل کی بجائے ان کی نفسیات کی گرہیں کھولنا زیادہ اہمیت کا حامل ہوگیا۔

۱۹۶۰ کی دہائی میں اردو افسانہ نے موضوع اور رجحان کے اعتبار سے ایک اور بڑی کروٹ لی۔درحقیقت اس تبدیلی کا بنیادی تعلق تہذیبی زندگی کی شکست وریخت اور پرانی اقدار کے بوسیدہ ڈھانچے کا منہدم ہونا تھا۔

عصری زندگی میں بدلتی ہوئی نت نئی ترجیحات نے شعور وآگہی کے کئی نئے در کھول دیئے۔قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر سیاسی اور سماجی حالات میں تبدیلی آئی۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے مادی آسائشوں کے ساتھ معاشرے میں ذہنی تناؤ اور الجھاؤ کو فروغ دیا۔ سیاسی بیداری، حریت پسندی اور خوف کی ایک نئی فضا بن گئی، حرب و ضرب کے جدید آلات نے انسانی تباہی کے نئے نئے طریقہ ایجاد کر دئے۔گوریلا جنگ اور چھاپہ ماروں نے زندگی کا سکون تہ وبالا کر دیا۔غلامی اور استحصال کے خلاف جنوبی ایشیا اور افریقہ میں کئی نئی تحریکوں نے سر اُٹھایا۔غلامی کے شکنجے میں جکڑی ہوئی کئی اقوام اپنی جدو جہد کے بل بوتے پر آزادی سے ہم کنار ہوگئیں۔عزم وحوصلہ کی اس سرکش لہر نے بہت سے مقتدر لوگوں کو ملک بدری پر مجبور کر دیا۔عرب اسرائیل جنگ، فلسطین اور ویت نام کا تنازعہ ایک تیسری عالمگیر جنگ کا اشارہ دینے لگا۔ بیرونی دنیا کے علاوہ پاکستان میں بھی حالات تیزی سے بدلنے لگے۔آمرانہ اقدامات اور جمہوریت کی ناکامی نے ملک کی سیاسی فضا کو بری طرح متاثر کیا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی بیروزگاری سے عوام الناس بے دلی اور بے حسی کا شکار ہو گئے۔اسی ماحول میں پاکستان کی نو خیز مملکت کو دو خوف ناک جنگوں سے واسطہ پڑا۔۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کا حوصلہ شکن المیہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ان دونوں واقعات سے پیدا شدہ حالات ومسائل نے قومی و عالمی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اس دور کے بیشتر افسانے انہی حالات کے غماز ہیں۔سماجی زندگی میں افراتفری، بدحالی، عدم مساوات، لاقانونیت، بدنظمی، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔اس منتشر ماحول نے اردو افسانہ کو بھی اپنے اثرات سے متاثر کیا۔اس سارے منظر اور پس منظر کا عکس اردو افسانہ میں کبھی کردار، کبھی مکالمہ اور کبھی ماحول کے حوالے سے ملتا ہے۔

پاکستان کے سیاسی منظر نامہ پر ابتدا ہی سے آمریت کے نقوش ثبت ہونا شروع ہوئے۔انفرادی اور اجتماعی تشخص کی گمشدگی، جبر وتشدد اور اخلاقی وتہذیبی انتشار اور غیر یقینی حالات نے اس منظر نامے میں سیاہی مایل رنگ بھرے۔یہ دور عوامی سطح پر بھی کئی تحریکوں کا دور تھا۔یہ تحریکیں نیم سماجی، نیم مذہبی اور نیم سیاسی تھیں۔ختم نبوت اور نفاذ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریکیں البتہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھیں دوسری طرف مشرقی پاکستان اور سندھ میں لسانی مسائل نے عوام کو مضطرب رکھا۔۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں بھی ہندوستان اور پاکستان کے عوام پر اثر انداز ہوئیں۔خاص طور پر ۱۹۷۱ء کی جنگ نے پاکستانیوں کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔اس دور کے افسانہ نگاروں مثلاً

انتظار حسین ، رشید امجد، انور سجاد وغیرہ کے ہاں اس موضوع پر کئی افسانے مل جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس دور میں لکھے جانے والے کئی ایک افسانے جذباتی اندازِ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً انتظار حسین کا ''سیکنڈ راؤنڈ'' اور ''موت کے تار'' لیکن کئی افسانے جنگ بندی کے بعد کی افسردگی اور تلخی کے مظہر بھی ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۷۱ء کے آس پاس لکھے جانے والے افسانوں میں مظلومیت اور قیام بنگلہ دیش کے بعد ہجرت در ہجرت کا المناک تجربہ اور ان عوامل واسباب کا تجزیہ جو اس المناک تجربے کا باعث بنے، کو موضوع بنایا گیا۔ بے اطمینانی اور بے دلی کی اس فضا میں بعض عالمی تحریکوں اور زندگی کے بارے میں فلسفیانہ بحثوں خصوصاً جدیدیت اور وجودیت کے زیر اثر عدم تحفظ، تنہائی اور بے یقینی کا احساس خوف کی فضا کے ساتھ مسلط ہوتا ہے۔ اس طرز احساس نے موضوعات اور ان کے برتنے کے ڈھب کو بھی خاصا بدل دیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان کمزور پڑنے لگا اور اس کے ردِ عمل کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن جدیدیت سے مکمل انحراف ۱۹۸۰ء کے بعد ہوا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد جو ادب منظر عام پر آیا اس کا رنگ و آہنگ قبل کے افسانوں سے مختلف تھا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے افسانوں میں مزدوروں، کسانوں، عورتوں اور نو جوان طبقوں اور بچوں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے لیکن پیش کش کا طریقہ وہی ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص نظریہ سے نہ ہو کر زندگی کے سچے تجربات ومشاہدات پر مبنی ہے۔ طبقاتی کشمکش، ذات پات کی تفریق، فرقہ واریت، جنسی ونفسیاتی مسائل، صنعت کاری کے اثرات، صارفیت، شہر کاری، عالم کاری، سائنس و تکنیکی ترقیات کے نتائج، دہشت گردی وغیرہ وہ موضوعات ہیں جو آج کے افسانوی ادب کے لیے ضروری قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور ان پر گفتگو کرنے میں معروضیت کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔

حیدر قریشی کا تعلق ستر کی دہائی میں سامنے آنے والے اردو ادبا کی نسل سے ہے۔ اس دور میں مختلف رجحانات ادب میں اثر پذیر تھے۔ ایک طرف مارکسی اندازِ فکر کی بنا پر معاشی وطبقاتی استحصال اور ناانصافیوں کو قلم کے ذریعہ بے نقاب کرنے کی کوشش کی جارہی تھی ساتھ ہی ساتھ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو جدید نفسیاتی فکر کو پیش نظر رکھ کر انسانوں کی نفسیاتی الجھنوں اور گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ دوسری طرف جدیدیت سے انحراف کی صورت بھی سامنے آئی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد مابعد جدیدیت افسانہ نگاری کی شروعات ہورہی تھی۔ موضوعات کا تنوع، بات کو فرد سے

شروع کر کے اجتماع تک اور اجتماع سے سماج تک پہنچانا، بات کو دوٹوک انداز میں کہنا، بدلتے ہوئے رشتوں کی نوعیت اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔حیدرقریشی نے خود کوکسی بھی رجحان سے الگ رکھا۔اپنی تخلیقات میں شعوری طور پر کسی نظام فکر یا مسائل کو بیان کرنا ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔ وہ اپنے اندر کی آواز پر توجہ دیتے ہیں۔حیدر قریشی کا ماننا ہے۔''کوئی بھی ادیب کسی بھی نظریہ کو ماننے والا ہو،لمحہ تخلیق میں وہ اپنے باہر سے آزاد ہوکراپنے اندر کی آواز پرلکھتا ہےتو اس کے اندر کے نظریہ سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑاادیب سمجھوں گا۔''(۸۰)

تخلیقی اظہار ذاتی فکر، تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہوتا ہے۔کوئی بھی باشعور شخص اپنی رائے بنانے کے لیے سمعی، بصری اورفکری صلاحیت کو استعمال کر کے اپنی تخلیق کے خدوخال سنوارتا ہے۔فطری طور پر ہر شخص کی آنکھ کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔اسی لیے ایک ہی تصویر کو دیکھنے کی نگاہ مختلف اور منفرد روپ دے دیتی ہے۔تجربہ احساس اور شعور دونوں کوجنم دیتا ہے۔شعوری طور پر دیکھنے میں فنکارانہ استعمال تجربے کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہےاور معنویت کی نئ سطحیں دریافت کرنے میں بھی مددگارثابت ہوتا ہے۔

حیدرقریشی نے اپنے دور کے تمام بین الاقوامی مسائل اور بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کو ذاتی مشاہدے کی نظر سے دیکھامنفرداسلوب اور نئے لب ولہجہ کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔انہوں نے مزدوراورمحنت کش کی زندگی گزاری ہےتو اس کے اثرات بھی ہیں،روحانیت سے انہیں لگاؤ ہونے کی وجہ سےتصوف کے بھی اثرات ملتے ہیں۔لیکن ان سب سے بڑھ کران کی اندر کی آواز ہے،جس نے انھیں سب سے زیادہ متحرک کیا۔بقول حیدرقریشی:

> میں تخلیقی لحات میں اپنی پوری توجہ اپنے اندر پرمرکوز رکھتا ہوں۔وہاں سے جوکچھ مل جائے پیش کر دیتا ہوں۔شعوری طور پر میں مذہبی انتہاپسندی کے برعکس تصوف سے زیادہ رغبت رکھتا ہوں۔میری ذاتی زندگی کے سارے نشیب وفراز لاشعوری طور پرمیرے شعور کی تعمیر مین اہم کردارادا کرتے رہے ہیں۔لہذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اورسوالات ہی میرے کسی نظام فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گےاور لاشعوری طور پرسہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں درآئے ہوں گے۔ (۸۱)

اس سلسلے میں ناصرعباس نیررقم طراز ہیں۔

> حیدرقریشی کے جدیدیت کے ساتھ ساتھ ان ترقی پسندوں سے بھی اپنی برات کا علان کیا ہے جوادب کوایک

..............................

۸۰۔ حیدرقریشی،انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی،۲۰۰۴،ص،۳۸۔
۸۱۔ سعیدشباب،(مرتب)،انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی،۲۰۰۴،ص،۹۱۔

نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔انھیں احساس ہے کہ ان کی تحریریں سماجی زندگی کے ٹھوس تجربات سے اپنا بنیادی مواد اخذ کرتی ہیں وہ ایک خاص مفہوم میں ترقی پسند ہیں۔مگر وہ تجربے کو اپنی روح میں حل کرنے اور پھر ایک فطری اور تخلیقی انداز سے تجربے کے اظہار کے قائل ہیں۔اس اعتبار سے ان کی شناخت (اپنے بیشتر معاصرین کی مانند) اپنے عہد کی دو بڑی تحریکوں (جدیدیت اور ترقی پسندی) سے ہٹ کر ایک اپنا راستا اختیار کرنے میں ہے۔ وہ اسے کوئی خاص نام نہیں دیتے۔ (۸۲)

حیدر قریشی نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو سیاسی اور ادبی سطح پر انتشار پھیلا ہوا تھا۔حیدر قریشی کا زندگی کے مسائل سمجھنے اور پرکھنے کا انداز انفرادی ہے۔اسی لیے صنعتی دور کے بدحالی، معاشی، سماجی پس منظر، انسان کی داخلی شخصیت، فکری اور جذباتی ناآسودگی، فرد کی تنہائی اور زندگی کی بے معنویت کے موضوعات کو حیدر قریشی نے زیرِ بحث لانے کی کوشش کی۔کامیاب افسانے کے لئے صرف اچھا مواد یا اچھی تکنیک کا ہونا لازمی نہیں بلکہ کامیاب فنکار ہر طرح کے موضوعات سے اچھا افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔ایک اچھے معمار کی طرح مضبوط اور عالیشان عمارت تیار کرنے میں بلند، عظیم اور عمدہ مواد ہ بہترین بنیاد فراہم کرتا ہے۔حیدر قریشی نے نازک اور چھوٹے موضوع کو نزاکت سے تراش خراش کر خوبصورت افسانہ کی شکل دی۔

حیدر قریشی اردو ادب کی ایسی آواز ہیں جو تازگی اور جدت کے ساتھ ساتھ تفکر کے بھی حامل ہے۔ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔شاعری، نثر سب میں ان کے کمالات دکھائی دیتے ہیں۔حیدر قریشی کی تخلیقی زندگی کا آغاز ۱۹۷۱ء کے نزدیک ہوتا ہے۔ابتدائی تخلیقات شعری صورت میں سامنے آئیں۔حیدر قریشی کے دو افسانوی مجموعے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں) ہیں۔ دو افسانوی مجموعوں کے بعد حیدر قریشی نے ۱۳ افسانے (کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار، نیک بندوں کی بستی، اپنے وقت سے تھوڑا پہلے) لکھے جو کہ ان کی کلیات ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' میں شامل ہیں۔

حیدر قریشی نے اپنا پہلا افسانہ ''اندھی روشنی'' ۱۹۷۸ء میں تحریر کیا۔ جسے انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام سے شائع کروایا۔''اندھی روشنی'' افسانہ ''جدید ادب'' خان پور کے ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں ان کی بیوی مبارکہ شوکت کے نام سے شائع ہوا۔خود ان کے نام سے چھپنے والا پہلا افسانہ ''مامتا'' ہے جو کہ ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں

..............................

۸۲۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویو، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۔

شائع ہوا۔ اوراق لاہور کے خاص نمبر، شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰، کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر پہلا افسانہ (اندھی روشنی) کی اشاعت کا تذکرہ موجود ہے۔ ''اوراق'' کا تذکرہ اقتباس اس طرح ہے:

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۷۹ء کے آخری شمارہ کے ذریعے میری اوراق میں انٹری ہوئی تھی۔ میری غزل اوراق میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ غزل کا مطلع تھا۔

اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا
جب ٹوٹتے تاروں سے کوئی جھانک رہا تھا

پھر میرے نام سے میرا پہلا افسانہ ''ماتا'' اوراق کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں ہوا۔ یوں یہ میرا پہلا افسانہ ہوا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ افسانہ ''جدید ادب'' خان پور کے ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں اپنی بیوی مبارکہ شوکت کے نام چھاپ چکا تھا۔ تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ مبارکہ شوکت کون ہیں؟ تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے افسانہ ''ماتا'' تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو بھیجا۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ وہ افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی دیکھ لیا اور وہ افسانہ میرے نام سے چھپنے والا میرا پہلا افسانہ ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہو گیا (۸۳)

حیدر قریشی آگے لکھتے ہیں ''میرے سب سے پہلے لکھے گئے افسانہ ''اندھی روشنی'' کو معیار (دہلی) کے پاکستانی افسانہ نگار نمبر (نیا پاکستانی افسانہ نئے دستخط، مطبوعہ ۱۹۸۲ء) میں میرے نام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔'' (۸۴)

حیدر قریشی اپنے افسانوں میں بے راہروی کے شکار کبھی نہیں رہے۔ انہوں نے اعتدال پسندی پر توجہ مرکوز رکھی ہے اور موضوع، اسلوب، ٹیکنیک، زبان اور مواد ہر لحاظ سے نیا پن اور نئی آویزشوں کے مابین زندگی کی حرارت اور بوقلمونی پیدا کی ہے۔ انہوں نے ایٹمی جنگ کے متوقع خطرے کا ادراک کر کے اس کے مابعد کی فضا پر تین کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''حوا کی تلاش'' ماہنامہ ''اوراق'' لاہور کے فروری، مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اسی موضوع پر ان کا دوسرا افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی''۔۔۔ ''اوراق'' کے ہی اپریل، مئی ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ دونوں افسانے ان کے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' میں شامل ہوئے۔ اور تیسرا افسانہ ''کاکروچ'' (مطبوعہ ماہنامہ ''صریر'' کراچی فروری ۱۹۹۲ء) بھی سائنسی ممکنات کے بیان پر مشتمل ہے۔

.....................................

۸۳۔ ادب ساز، دہلی، شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۸، ص ۴۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۴۔

حیدرقریشی کے افسانوں کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں ۔کسی خاص موضوع پر وہ زورصرف نہیں کرتے لیکن جس موضوع کو وہ اپنے افسانے میں اُٹھاتے ہیں اس کا تعلق آج کے دور کے انسان اوراس کے گردونواح کی فضا سے ہے۔حیدرقریشی کے یہاں تین قسم کے افسانے پائے جاتے ہیں ۔اول وہ افسانے جو سیاست کے گرد طواف کرتے ہیں دوم وہ افسانے جن کا تعلق سماجی مسائل سے ہے۔سوم وہ افسانے جو انسانی نفسیات پر مبنی ہیں ۔موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں ۔

مغرب میں لکھنے والوں نے جنسی چکا چوندیا پھر فیشن زدہ دہریت کو اپنا موضوع بنانے کی کوشش کی تھی۔جبکہ اس حوالے سے اردو میں پہلے ہی زیادہ اور اچھے کام ہو چکے ہیں۔۔۔۔تارکین وطن پر بھی اچھا لکھا جا چکا ہے ۔ہجرت اور قیام پاکستان پر دونوں طرف اچھی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں ۔میرا خیال ہے کہ مغرب میں آنے کے نتیجہ میں ہم لوگ علوم اور تیکنالوجی کے حوالے سے کچھ نیا پیش کر سکتے ہیں ۔(۸۵)

حیدرقریشی شاعری سے افسانہ کی طرف آئے ۔وہ بنیادی طور پر ایک حساس شخصیت رکھتے ہیں،معاشرے میں ہورہی سیاسی اُتھل پتھل سے متاثر نہ ہوتے ایسا ممکن نہ تھا۔حیدرقریشی کی فکری ترتیب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوئی۔معاشی ناانصافی اور سیاسی وسماجی استحصال کے مختلف پہلوؤں کا نہ صرف انہوں نے بغور مطالعہ کیا بلکہ اپنے اردگرد پھیلی زندگی میں موجود تلخ حقائق کو تجزیہ کی باریک بینی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ۔ان کے افسانوں کا منظرنامہ معاشرے میں چھائی بے چینی واضطراب سے متعلق ہے جہاں ہر بڑا ادیب کھڑا نظر آتا ہے۔ان کے اکثر افسانے چھوٹی چھوٹی تصویروں کی صورت میں ہیں ۔ایک کے بعد ایک منظر بتدریج ابھرتا اور زندگی کی کربناکی میں ایک جھنجھوڑے ہوئے ذہن کا نوحہ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔افسانہ''غریب بادشاہ'' سے مثال دیکھئے:

۱۔ چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس،سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ،پسینے سے شرابور اس مجہول سے فقیر نے جس انداز میں یہ مصرعہ گاتے ہوئے پڑھا ہے اس کا ایک ایک لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ میری روح میں اتر گیا۔

۲۔ ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں بھٹہ واہن گیا۔وہاں مجھے پتہ چلا کی سسی کی جنم بھومی بھٹہ واہن تھی ۔

وہاں کے راجہ کی بیٹی ،سسی جسے راجہ نے نجومیوں کے مشورے کے بعد صندوق میں بند کر کے دریا کے دھاروں کے سپرد کر دیا تھا اور یوں وہ بھٹہ واہن سے بھنبھور پہنچ گئی

.............................................

۸۵۔ سعید شباب،(مرتب)،انٹرویوز،ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی،۲۰۰۴ء،ص،۹۱۔

۳۔نو جوانی میں پڑھے لکھے ذہنوں کو سوشلزم کا طلسم متاثر ضرور کرتا ہے، پختگی آنے سے پہلے نو جوان ایسی ہی جوشیلی باتیں کرتے ہیں۔
اس بحث سے ہٹ کر دیکھیں تو آج کے مزدوروں کی فطرت کا یہ عالم ہے کہ ان کی دائیں مٹھی میں نوٹ دے دیں تو بایاں ہاتھ آگے کر دیں گے، بائیں ہاتھ کو بھر دیں تو دایاں ہاتھ آگے کر دیں گے۔ جہاں نوٹ ملنے میں اسٹاپ آیا، وہیں حق تلفی کے نعرے گونجنے لگیں گے۔

۴۔ قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہوسکتا۔
ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔

۵۔ گھنے جنگل کے درمیان ایک وسیع وعریض میدان، گہری تاریک رات، میدان کے ایک سرے پر ایک چبوترے پر قبیلے کا سردار اپنی قبائلی آن بان کے ساتھ براجمان ہے۔
اس کے پیچھے، دائیں بائیں جری کمان دار چوکس کھڑے ہیں۔
میدان کے وسط میں آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔
سردار کے دائیں، بائیں دونوں اطراف سے لے کر میدان کے دوسرے سرے تک الاؤ کے گرد لوگوں کا ایک دائرہ سا بن گیا ہے،
لوگوں نے اپنے سیاہ چہروں پر چکناہٹ مل کر خود کو چمکایا ہوا ہے، ڈھولک کی تھاپ گونجتی ہے اور پھر گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔
پھر اس تھاپ کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا ساز ابھرتا ہے۔
مجھے لگتا ہے میں اس ساز سے واقف ہوں لیکن کچھ یاد نہیں پڑتا۔ عجیب سا ساز ہے،
ایک لمحے میں روح کی پاتال تک اتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے۔
مسرت اور خوف کی عجیب سی کشمکش۔۔۔

یہ تمام واقعے ایک افسانہ کا حصہ ہیں۔ یہاں مثال کے لئے میں نے انہیں الگ الگ کر کے پیش کیا ہے ، جب کہ یہ تمام واقعات افسانے میں تسلسل سے بیان کئے گئے ہیں جو انفرادی طور پر خود ایک کہانی بیان کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کے یہاں اس طرح کے مناظر عام ہیں۔ وہ فرد سے بات شروع کرتے ہیں اور جلد ہی اسے اجتماع تک پھیلا دیتے ہیں۔ کہانی کا معنوی پھیلاؤ کسی ایک نقطے میں مرکوز ہونے کے بجائے کل کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حیدر قریشی کی کہانیاں انسان کی اس اجتماعی بے بسی کی داستانیں ہیں جو کسی صحت مند معاشرے میں اس کی مجموعی

قسمت کا حصہ ہوتی ہیں۔خورشید اقبال لکھتے ہیں:''حیدرقریشی چاہے جس بھی موضوع پر لکھ رہے ہوں وہ کھل کر لکھتے ہیں۔اپنے جذبات کو بلا جھجک کاغذ پر منتقل کرتے ہیں۔'' (۸۶)

حیدرقریشی کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کی مماثلت نہیں ہوتی، ہر کہانی کا اپنا الگ انداز ہے۔ہر افسانہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔ان کے افسانے اپنے اندر زندگی کی نئی حرارت اور نیاپن لیے محسوس ہوتے ہیں۔موجودہ دور میں انسان کو جس قسم کے مسائل درپیش ہیں اور نت نئی تبدیلیوں کے باعث تہذیب و ثقافت جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے، حیدر قریشی نے افسانہ میں اس کا فنکارانہ اظہار کیا ہے۔بقول پروفیسر جیلانی کامران:

> حیدرقریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارہ کیا ہے اوراس سچائی کونمایاں کیا ہے کہ limit situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتااور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ہماراافسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شایداب تک غافل تھا۔حیدرقریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔۔۔حیدرقریشی کے افسانے ایک نئے طریقہ سے قاری تک پہنچتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔اس اعتبار سے ان کے افسانوں میں ایک ایسارویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔(۸۷)

حیدرقریشی جنھوں نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا بیان الگ انداز میں کیا۔ان کی تمام تر تخلیقات میں ایسے متعدد قصے بھرے پڑے ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔گھر، خاندان، تعلیم، ملازمت، ادبی زندگی کا آغاز، اپنوں کا دکھ سکھ، اپنے ملک سے کٹ کر نئے ملک کا حصہ بننے تک کے تمام واقعات ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں۔۳۴ کتابوں کے مالک حیدر قریشی نے کسی بھی موڑ پر قاری کو اپنی زندگی سے الگ ہونے کا احساس نہیں دلایا۔اپنے ملک سے دوری کا احساس بطورِ موضوع ان کے افسانوں میں نہ نظر آئے لیکن ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی شکل میں ہمیں ضرور نظر آتا ہے۔اس وقت کے معاشی حالات جو بھی تھے، اس سے وہ متاثر ضرور ہوئے۔کہتے ہیں۔''پاکستانی معاشرے نے معاشی تنگدستی کے باعث مجھے خودکشی کے مقام تک لا کر کھڑا کیا تھا۔'' (۸۸)

.........................................

۸۶۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴، ص، ۱۴۰۔

۸۷۔ ادب ساز، دہلی، شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۰۸، ص، ٦۔

۸۸۔ سعید شباب، (مرتب)، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴، ص، ٦۲۔

فطرتاً قناعت پسند ہونے کی وجہ سے انھوں نے گزرے ہوئے وقت کا ماتم منانے سے کہیں زیادہ ضروری آنے والے وقت کو بہتر بنانا سمجھا۔اور یوں بھی حیدر قریشی ۲۴ گھنٹوں کو ۴۸ گھنٹوں میں تبدیل کرنے کا گر جانتے ہیں۔ وہ تخلیق کرنے کے لیے اپنے اندر کی آواز کا انتظار کرتے ہیں۔قدرت سے خود کو قریب محسوس کرتے ہیں اور ماضی کی یادوں کو دل سے لگائے پھرتے ہیں۔ ہم سب کو ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے،شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی ایک وقت کے بعد ہمیں اداس کرنے لگتی ہے۔اس وقت شاید دنیا کا ہر انسان اپنی جڑوں کی طرف پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہے۔حیدر قریشی نے اپنی کہانیوں میں اسی خمیر اسی معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔سماج کے تلخ مسائل کو انہوں نے بطور خاص موضوع بنایا۔جنس ،معاش اور اخلاقی و روحانی پستی کی متنوع تصویریں موزوں رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کے افسانوں میں اظہار پاتی ہیں۔

## حیدر قریشی کے افسانوں میں سیاسی جہت:

حیدر قریشی کے افسانوں کا موضوعاتی دائرہ اپنے عہد کے جبر،عدم تحفظ، بیگانگی اور منافقت کے حوالے سے ہے۔اپنے فنی سفر کی ابتدا ہی میں انہیں ایوب خان کے مارشل لاء سے واسطہ پڑا۔گھٹن،جبر و تشدد اور پابندیوں کے اس دور کا انجام ایک بڑی ہلچل کی صورت میں ہوا۔ جمہوری آزادیوں کی تحریک،یحیٰی خان کا مارشل لاء، قیام بنگلہ دیش، ،قومی اتحاد کی تحریکیں ،بھٹو کی پھانسی اور ضیاء الحق کا مارشل لاء پے در پے ایسے حوادث تھے جنھوں نے ہر سطح پر بے چینی اور اضطراب کے رویے پیدا کیے۔حیدر قریشی نے ایک حساس فنکار کی حیثیت سے ماحول کی کربنا کی اور اذیت کو فوکس کرنے کی کوشش کی ۔یوں حیدر قریشی نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا پاکستان کی سیاسی صورت حال کے مدِ نظر کی۔ان کا پہلا افسانہ ''اندھی روشنی''ایک شاہکار افسانہ ہے۔ جو کہ سیاسی پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔یہ افسانہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' میں شامل ہے۔بظاہر یہ افسانہ ماڈرن سوسائٹی کی عیش وعشرت سے بھرپور زندگی میں ہو رہے گناہ وثواب کو ظاہر کرتا ہے،لیکن صحیح معنوں میں یہ افسانہ پاکستان کی سیاست کے اس المیہ کو پیش کرتا ہے جو جنرل ضیاالحق ء کے دور میں پیش آیا۔پاکستان نے امریکہ کے ساتھ کئی معاہدے کیے ان معا ہدوں کے اغراض ومقاصد حسبِ ذیل ہیں:

۔پاکستان اور بھارت کے مابین طاقت کے عدم توازن کا استیصال وتدراک۔

۔ طاقت ور بھارت کے معاہدانہ رویے کی وجہ سے پاکستان بھاری دفاعی اخراجات برداشت کرنے پر مجبور تھا ان اخراجات کا بوجھ کم کرنے کے لیے امریکہ سے معاہدے کرنا پڑا۔

۔ پاکستان اپنے طاقت ور ہمسایہ بھارت کے ساتھ کشمیر اور دوسرے مسائل طے کرنے کے بارے میں امریکہ کی اخلاقی سفارتی اور سیاسی معاونت چاہتا تھا۔

۔ پاکستان اپنی اقتصادی و معاشی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی امداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔اور یہ امداد کثیر مقدار میں امریکہ سے ہی میسر آسکتی تھی۔(۸۹)

اس سلسلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ذہن پر زور دیجئے۔۔۔وہ گندم سرخ رنگ کی تو نہیں تھی؟''اجنبی سوال کرتا ہے۔۔پھر ایک بھرپور قہقہ لگا تا ہے اور خود بھی اس قہقہے میں گم ہو جاتا ہے۔ہم دونوں ہی جیسے نیند سے بیدا ہو گئے ہیں۔سرخ گندم کا مطلب سمجھتی ہو؟ اوہ۔۔۔اب سمجھی۔۔۔اس کا اشارہ امریکی گندم کی طرف تھا۔

سالا کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا تھا۔

میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔''

آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیش نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

میرے اندر کا' میں' سورج نکلنے سے پہلے ہی مر گیا۔'' (اندھی روشنی)

کامران کاظمی لکھتے ہیں :''حیدر قریشی اس افسانے ''اندھی روشنی'' میں جس بنیادی المیے کا ذکر کرتے ہیں وہ مختلف ہے۔اور وہ المیہ تب جنم لیتا ہے جب پاکستان جیسا زرعی ملک اپنی زرخیز زرعی زمینوں سے مالا مال ہونے کے باوجود قحط جیسی صورتحال کا سامنا کرنے پر امریکی گندم درآمد کرتا ہے۔''(۹۰)

افسانہ ''اندھی روشنی'' موضوعاتی اعتبار سے متنوع ہے۔افسانہ میں انسانی وسماجی حقیقتوں کا مختلف عکس دکھائی دیتا ہے۔افسانہ کی ابتدا سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے انسانی کلب کی منظر کشی کی ہے۔مثال۔

..............................................................

۸۹۔ ہمایوں ادیب، پاکستان کی خارجہ پالیسی، لاہور:عزیز پبلیشرز اردو بازار ۱۹۸۸ء ص ۳۶۳۔

۹۰۔ ''اردو افسانوں کا ایک مطالعہ''،مشمولہ، عکاس اسلام آباد مارچ ۲۰۰۷،ص ۸۳۔

''اندر داخل ہوتے ہی میری انکھیں چندھیا کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف روشنی کا سیلاب پھیلا ہوا ہے۔
دیواروں پر بڑے بڑے آئینے نصب ہیں جو روشنی کے سیلاب کی شدت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔
میں نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔
جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی بلکل ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟''

(اندھی روشنی)

وہیں دوسری طرف مرد اور عورت کے اس رشتے کو پیش کیا ہے جو ازلی ہے۔ مرد کتنا بھی غلط ہو الزام ہمیشہ عورت کے وجود پر ہی آتا ہے:

''تم نے گندم کی تہمت میرے سر کیوں لگائی؟''

''فریب!۔۔۔ مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔'' اس کے لہجے میں بلا کا طنز ہے۔۔۔'' اپنی عیاشی کا سامان بھی پورا کرتا ہے اور اپنی ساری غلطیوں کا بار بھی عورت ہی پر ڈالتا ہے''

(اندھی روشنی)

حیدر قریشی اپنے افسانے میں سچ کو مکمل طور پر واضح نہیں کرتے بلکہ ایک جھلک دکھاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں:

''لیکن گندم۔۔۔
سنو۔۔۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔ گندم کی ہیئت پر غور کرو اور اپنی اس کمزوری پر بھی غور کرو جس کے بغیر تم رہ نہیں سکتے۔ بڑے بڑے تجرد پسند جس کے لیے بالآخر مجبور ہو گئے۔
تم فحش اور ننگی باتیں کر رہی ہو۔
سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا۔ اسی لیے ننگا نظر آتا ہے۔''

(اندھی روشن)

پاکستان کی سیاسی صورت حال بالآخر مارشل لاء اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیاں بھی حیدر قریشی کے ہاں اہم موضوع ہے۔ آمریت کے زمانے میں پابندی افکار و اظہار، ظلم، تشدد اور استحصال کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے کئی افسانے لکھے۔ '۲۷۵۰ سال بعد'، 'دھند کا سفر'، 'اپنی تجرید کے کشف کا عذاب' شناخت اس سلسلے میں ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ جبر کے خلاف لکھتے ہوئے ان کے لہجے کی تلخی کچھ زیادہ ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں طنز سے کام لیا گیا ہے۔ وہ اپنے شعور کی مدد سے سماج کو ایک متعین راہ دکھاتے ہیں لیکن سماج کے طرز عمل کو نہ بدل

سکنے کا المیہ بھی پیش کرتے ہیں۔''دھند کا سفر''، اس ساری صورت حال کی نمائندہ کہانی ہے۔کہانی میں بچے کا کردار مستقبل کا نمائندہ ہے۔مثال۔

'' ایک اسٹیشن پر مسافروں کا ایک بڑا تیز ریلا اندر آ تا ہے۔چھوٹے سے اسٹیشن پر اتنے مسافر!.....
شاید کوئی بارات ہو۔! گاڑی چلتی ہے تو مسافروں کے اوسان بحال ہونے لگتے ہیں۔ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایک ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔
دو چار اور مسافروں نے بھی ایسی ہی گالیاں دیں تو پتہ چلا سارے بے چارے فرسٹ کلاس کے فرش پر بیٹھے تھے۔
سب سے دس دس روپے جرمانہ وصول کر کے بغیر رسید کے سب کو اس ڈبے میں دھکیل دیا گیا ہے۔
گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔
گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئرمین تک پہنچ چکی ہیں۔پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔
جتنے منہ اتنی باتیں۔بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک ''یک چشم'' داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔
میں سناٹے میں آ گیا ہوں۔اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔
مجھے لگتا ہے ہم سب زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔
گردن تک ہم زمین میں دھنس گئے ہیں۔
میرے اندر کا وہ پانچ سالہ بچہ نکل کر زنجیر کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور میرے اشارے کا منتظر ہے۔
میں اس یک چشم داڑھی والے کو سخت لعن طعن کرتا ہوں۔
''بابائے قوم کا کیا قصور ہے؟ یہی کہ اس نے تمہیں آزادی دلائی ہے.....میں لمبی چوڑی تقریر کرتا ہوں۔
مگر وہ یک چشم داڑھی والا بڑی متانت سے پھر وہی گالی بابائے قوم کا نام لے کر دہراتا ہے۔
آخر میں اپنے اندر کے اس پانچ سالہ بچے کو اشارہ کرتا ہوں کہ وہ زنجیر کھینچ دے مگر اس دوران ہی ایک بے حد خوبصورت خاتون سے اس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور وہ جوان ہونے لگتا ہے۔پہلے وہ زنجیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
اب اس خوبصورت خاتون کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔میں خود آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔۔۔'' **(افسانہ ''دھند کا سفر'' سے اقتباس)**

ریل گاڑی سماجی منافقت کے مختلف مظاہر کا نظارہ پیش کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔یہ منزل تک پہنچنے کا اجتماعی سفر ہے۔کہانی میں موجود بچہ کا کردار جو کہ اپنے معاشرے کے مزاج سے الگ سوچتا سمجھتا ہے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔اور بانی پاکستان کو گالی دینا گویا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جس پر گرفت کی جاسکے۔سماج میں قانون کی

اصل صورت کیا ہے اس کو بھی افسانہ میں پیش کیا گیا ہے۔مثال۔

''گاڑی رک گئی ہے۔ریلوے گارڈ،ٹکٹ چیکر اور کچھ پولیس والے آ چکے ہیں۔
میں انہیں بتاتا ہوں کہ اس ذلیل شخص نے بابائے قوم کی شان میں گستاخی کی ہے۔
مگر شاید ریلوے کے عملہ کو میری بات سمجھ نہیں آتی۔گارڈ اور چیکر میری بات سے جھلا گئے ہیں۔
اور پھر چیکر میرے جرمانے کی رسید کاٹنے لگتا ہے۔پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔
پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔
اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں
زنجیر کے نیچے کھڑا پانچ سالہ ''میں'' پھر حیرت سے اس تحریر کو پڑھ رہا ہوں۔
گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا'' (افسانہ''دھند کا سفر'')

کہانی ''بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے'' بھی پاکستان کی سیاسی صورت حال کی عکاس ہے۔مثال۔

''ملک میں حکومت کی تبدیلی سے پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔
پہلے مزدوروں کو جتنی بے جا چھوٹ دی گئی تھی اب اس سے بھی زیادہ بے جا گرفت ہو رہی تھی۔اس حد تک کہ میں جو مزدوروں کی بے جا چھوٹ کے عہد میں اپنی مزدور یونین کا معتوب مزدور تھا، مجھے اس یونین کا سرگرم رکن بن جانا پڑا۔
اس لئے کہ مسئلہ میری ذات کا نہ تھا مزدور کے اجتماعی مفاد کا تھا۔
انہیں دنوں ایک اور صنعتی ادارے میں ایک معمولی سے بہانے کی آڑ میں سینکڑوں مزدوروں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دئے گئے۔
یہ حکومت کی طرف سے ملک کے تمام مزدوروں کو بھرپور عملی دھمکی تھی۔
مزدور اس دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے مزید اشتعال میں آ گئے۔
تاہم سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔
میری ان غیر متوقع کامیابیوں نے میرے اس شک کو مزید تقویت پہنچائی کی تقدیر کا شوشہ سرمایہ داروں اور استحصالی قوتوں کی اختراع ہے۔
(بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے)

''میں سمندری دیوتا کی صلاحیتوں، بالخصوص سیاسی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔شاید میرے دل میں کہیں ابھی بھی اس کے لئے تھوڑی بہت

محبت کے جذبات موجود ہوں۔پوسی ڈان کے دادا سے تو میں اب بھی متاثر ہوں ۔سمندری دیوتا سے میرے اختلاف کی دو بنیادی وجوہات
ہیں۔ایک یہ کہ میں بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کے بے جا اختیارات اور ظالمانہ اقدامات کی مذمت کرتا ہوں۔
جبکہ سمندری دیوتا کا خیال ہے کہ اسکے مقرر کردہ مشیروں کی مذمت کرنا خود دیوتا کی مذمت کرنے کے مترادف ہے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ سمندر کی گہرائی اور وسعت کے احساس کے باوجود میرا خیال ہے کہ سورج ،سمندر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔
اسی لئے میں سمندر دیوتا کے مقابلہ میں سورج دیوتا کو کہیں زیادہ عظیم سمجھتا ہوں۔

**(۲۷۵۰سال بعد)**

اسی افسانہ سے ایک اور اقتباس ملاحظ ہو۔
بظاہر سات سمندر پار کرنے کے لئے مجھے سمندری دیوتا کی خوشنودی حاصل کر لینی چاہیےلیکن میں جانتا ہوں کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعے
سات سمندر پار کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔
اس دوران اگر سمندری دیوتا نے اپنے سیاسی اور سازشی ذہن سے کام لے کر کہیں مجھے مزید الجھانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو میں نے
بھی ڈپلومیٹک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔
یوں بھی کسی کو بلیک میل کر کے جھکانے والوں کی انا کی تسکین تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

**(۲۷۵۰سال بعد)**

## انسان کے ذہنی الجھاؤ اور سماجی نفسیات:

حیدر قریشی کے افسانوں کی ایک جہت نفسیاتی حقیقت نگاری بھی ہے۔حیدر قریشی نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی وسماجی اور اخلاقی ونفسیاتی مسائل کو موضوع سخن بنایا۔انہوں نے زندگی کے مختلف خصائص کو تخیل کی نظر سے دیکھا اور باطن کے داخلی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا کام بھی کیا۔زندگی کی سچائیوں سے وہ معنی تلاش کرتے ہیں۔''گھٹن کا احساس'، 'دو کہانیوں کی ایک کہانی'، 'روشن نقطہ'، 'اعتراف' ان کی اس فکر کو پیش کرتے ہوئے افسانے ہیں۔افسانے کا موضوع انسان اور انسان کے ذہنی ،نفسیاتی اور جذباتی مسائل ہیں۔ان افسانوں میں معاشرتی وسماجی جکڑ بندیوں کے شکار انسان کی جذباتی کیفیتوں اور ہر لمحہ تبدیل ہوتی ذہنی حالتوں کو پورے درد وکرب سمیت سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عہدِ حاضر کا انسان اپنی اصل سے دور ہو چکا ہے۔جس سکون کی تلاش وہ ظاہر میں کر رہا ہے، وہ دراصل اس کے باطن میں موجود ہے جس کا اسے احساس نہیں۔افسانہ''گھٹن کا احساس'' کا مرکزی کردار ایک ایسے دوراہے پر

کھڑا ہے جہاں اسے خود نہیں معلوم کہ اسے کہاں جانا ہے اور اس کا اگلا قدم اسے کس طرف لے جائے گا۔ انسانوں کی بھیڑ میں جب وہ اپنی زندگی کی معنویت پر غور کرتا ہے تو اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج مشینی اور صنعتی تہذیب نے وجود کو ہر طرح سے مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال۔

''وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جُڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔

جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور پانی سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔

بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نیچے گر پڑے گا۔

اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جُڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ تین سو میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔''

(گھٹن کا احساس)

وہ سوچتا:

انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈالے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنائے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔ جیتے جی قبر میں گرانے والی۔ اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔

اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ایک بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا۔

جب سوچتے سوچتے اس کا دم گھٹنے لگا وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے کے قریب آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے گیٹ کے دائیں بائیں نصب شدہ دونوں ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اندر آتی ہوئی تیز ہوا سے گھٹن کا احساس کم ہونے لگا۔ اسے قدرے سکون مل رہا تھا لیکن پھر یکا یک اس کے ذہن میں عجیب سا خیال آیا۔

چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔

پھر یوں لگا جیسے یہ خیال نہیں کوئی غیبی آواز ہے جو اسے حکم دے رہی ہے: چھلانگ لگا دو۔ (گھٹن کا احساس)

افسانہ ''روشن نقطہ'' بھی انسان کی ذہنی الجھن کی کہانی ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار توحید کا بھید جاننے کو بے قرار ہے۔ اپنی اس کشمکش کو لے کر وہ پیر سائیں کے پاس جاتا ہے۔ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا راز جاننے کو بے قرار آج کا انسان کس قدر الجھا ہوا ہے اس کی عکاسی افسانہ نگار نے روشن نقطہ کے ذریعے کی ہے۔

''روشن نقطہ'' افسانہ سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''توحید کا بھید!''

پیر سائیں کی آواز لرزی ''تم نے سنا نہیں۔جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔

اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہے۔کیونکہ 'بے مثال' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا'' پیر سائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔

''اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے'' پیر سائیں کے بیان سے میں جھومنے لگا۔

مجذوب فقیر نے بھی الا اللہ۔الا اللہ کی صدائیں بلند کیں۔

''سائیں پھر تو ساری بات ایک الف پر ہی تمام ہو جاتی ہے'' مجھے بلھے شاہ یاد آ گئے۔

''تم نے الف سے آگے کا سبق نہیں پڑھا۔الف بھی زیادہ ہے''

اس دفعہ پیر سائیں کی بجائے مجذوب فقیر بولا اور مجھے یوں لگا جیسے بھونچال سا آ گیا ہے۔پیر سائیں بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے۔''

مجذوب فقیر اپنی لے میں بولا

''الف تو بہت زیادہ ہے۔بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔''

--------------------

اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی! **(روشن نقطہ )**

**اسی صورتحال کا عکس ایک اور کہانی ''دو کہانیوں کی ایک کہانی''میں بھی نظر آتا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔**

''شاہ جی! آپ نے کہا تھا نا کہ

شیطان جنوں میں بھی ہوتے ہیں اور،انسانوں میں بھی اور یہ کہ ہم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔سو کارخانے کے مالک اور کالونی کی زلیخا، میں دونوں میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور ان دونوں سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی، میں کارخانے کی نوکری چھوڑ دوں۔

اور شاہ جی! میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔''

**(دو کہانیوں کی ایک کہانی)**

## جنسی حقیقت نگاری:

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری کو بھی جگہ دی۔اس ضمن میں ان کا افسانہ ''اعتراف''، ''بھولے کی پریشانی''، ''انکل انیس''، '' آپ بیتی'' قابلِ ذکر ہے۔ذہنی، جنسی اور نفسیاتی مسئلے پر یہ افسانے بھرپور تاثر رکھتے ہیں۔دراصل افسانہ نگار کا ماننا ہے کہ انسان صرف شرافت کا پتلا اور نیکی کا مجسمہ نہیں بلکہ اس میں بدی، غلاظت، بدصورتی اور حیوانیت بھی موجود ہے۔لیکن ان کی جنسی حقیقت نگاری میں وہ ترفع اور تہذیب کا احساس نہیں ہوتا جو منٹو، بیدی، عصمت کے یہاں ہوتا ہے۔وہ جنس پر کھل کر بات نہیں کرتے بلکہ ہلکا ٹچ دیتے ہیں۔حیدر قریشی کے افسانوں میں جنس کبھی عریانیت اور فحاشی کے دائرے میں داخل نہیں ہوا۔ یہ کہنا شاید زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری دراصل ضمنی موضوعات کے زمرے میں آتی ہے۔افسانہ ''اعتراف'' میں حیدر قریشی نے مکھی کی نفسیات سے جنسی عمل تک کا سفر طے کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مجھے اپنی ساری زندگی میں صرف دو دفعہ شدید پچھتاوا ہوا ہے۔

ایک دفعہ تب ہوا جب میرے بچپن کے دوست اور لندن میں مقیم شاعر کی میم بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا دوست جنسی لحاظ سے ناکارہ ہو گیا ہے اور اب نوجوان لڑکوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا objective گزارا کر رہا ہے۔

اُس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے دوست کا لحاظ مار گیا۔میں نے اپنی جھولی میں خود بخود آ کر گرنے والے پھل کو اُٹھا کر اپنے دوست کی فرج میں رکھ دیا۔اپنی اس شرافت پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ مجھے اس میم کو مایوس نہیں کرنا چاہئے تھا۔

دوسری دفعہ مجھے اس وقت پچھتاوا ہوا جب لاہور کی ایک بُری عورت کی خواہش میں نے پوری کر دی۔

مجھے اس عورت کی صورت کسی مکھی کی طرح لگنے لگی ہے اور اسی لئے میرے پچھتاوے میں کراہت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

میں نے یہ باتیں بھی اپنی بیوی کو بتا دی تھیں۔''

( اعتراف )

آج اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصوّر ابھرنے لگتا ہے۔

ماں سے طبیعت کا بہانہ کر کے میں بیٹھک میں آ کر بظاہر سو جاتا ہوں۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے دائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو ہاتھوں میں

تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔

مگر مجھے جیسے یکدم کرنٹ لگ گیا ہے۔

میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔میری ننھی بچی۔۔۔۔جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔
میں خوف زدہ ہو کر بیٹھک سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتا ہوں۔اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔

( آپ بیتی )

افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' کے دوسرے درویش کی کہانی ورکنگ ومین کے جنسی،نفسیاتی اور معاشی مسائل کو پیش کرتی ہے۔جہاں گھوڑی بن کر بیوی نوکری کرتی ہے وہیں شوہر گدھے کی صورت مادی زندگی کا بوجھ ڈھوتا ہے۔ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی لکھتے ہیں'' بیوی عیش کوشی کی فکر میں اپنے منصب سے خیانت کرتی ہے۔''(۹۱) لیکن یہاں عورت ہی صرف غلط نہیں بلکہ افسانہ نگار نے درویش کی زبانی اس کا جرم خود قبول کروایا ہے۔

''اب مجھے صحیح طور پو یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا،گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا۔۔۔''

(گلاب شہزادے کی کہانی)

کامران کاظمی لکھتے ہیں:''یوں اب غیر محسوس طور پر درویش کا کردار بدل جاتا ہے اور وہ گدھے سے گھوڑی کا مالشیا بن جاتا ہے اس کی ٹہل سیوا کرتا ہے۔اور سواری کے شوقین افراد کو پیش کرتا ہے۔''(۹۲)
بڑھاپے کی شادی کو موضوع بنا کر جنسی حقیقت نگاری پر حیدر قریشی کا لکھا افسانہ'' بھولے کی پریشانی'' سے یہ اقتباس دیکھئے:

''چودھری اللہ دتا صاحب نے دوسری شادی بھی کی تو کیسی فضول سی جگہ۔
یہ عورت گو عمر میں ان سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن پہلے ایک جج کی بیوی رہ چکی ہے۔
جج نے اس پر برائی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی تھی۔
اور وہ عورت۔۔۔ابراہیم کی بیٹی' جو نئی چوہدرانی کی گہری دوست ہے' منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔
اس نے شادی والے دن چوہدری اللہ دتہ صاحب کو سالی بن کر دودھ پلایا تھا اور دودھ پلائی کے پیسے لئے تھے۔
نئی چوہدرانی کی یہ منہ بولی بہن اپنے گاؤں کی وہ تاریخی لڑکی ہے جو اپنی جوانی میں گاؤں سے بھاگی تھی۔
کسی لڑکی کے گاؤں سے بھاگنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔کم بخت بھاگی بھی غیر مذہب والے کے ساتھ۔''

..............................

۹۱۔ عکاس اسلام آباد،(کتاب نمبر۴) شمارہ: اکتوبر ۲۰۰۵ص،۲۸۔
۹۲۔ ''اردو افسانوں کا ایک مطالعہ''مشمولہ،عکاس،اسلام آباد،شمارہ: ۵ مارچ ۲۰۰۷ء،ص ۱۸

''ایک کہہ رہا تھا کہ نکاح کے چھوہاروں اور مکھانوں کے ساتھ ٹافیاں اور غبارے کیوں تقسیم کئے گئے؟ کیا پتہ کیوں تقسیم کئے گئے!''
چوہدری اللہ دتہ صاحب اندر سے بلکل خالی ہیں۔ پھوکی ٹوَر بنانے کے لئے انہوں نے شادی کا تماشہ کیا ہے۔اگر واقعی چوہدری میں دم خم ہے تو پھر اس بیوی سے بھی اولاد پیدا کر کے دکھا دیں۔''
''کل رات چوہدری اللہ دتہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ ان کے بیڈ روم کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کر دوں۔
انہوں نے مجھے اپنے بیڈ روم تک پہنچایا تھا اور دروازے سے ہی لَوٹ گئے تھے۔میں اندر گیا تو وہاں نئی چوہدرانی بیٹھی ہوئی تھیں۔میرے قریب آ گئیں۔ان کی آنکھیں اور چہرہ بڑا عجیب سا ہوتا جا رہا تھا۔اب میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا کرنے لگی تھیں۔جب وہ مجھ سے بالکل ہی لپٹ گئیں تب میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا۔لیکن بدحواسی میں مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا اور میں قریب کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا''
بعد میں بھولے نے دیکھا کہ بیڈ روم کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے اور کل رات سے چوہدری صاحب اچانک کہیں چلے گئے ہیں۔
**( بھولے کی پریشانی )**

## اخلاقی قدروں کا انہدام اور نئی قدروں کی تعمیر:

حیدر قریشی کے نزدیک اہم سوال قدروں کے کھو جانے کے حوالے سے ہے۔ پرانی قدروں کا انہدام اور نئی قدروں کی تعمیر ،اجنبیت ، بے گانگی ،تنہائی ،ٹوٹتے بکھرتے رشتے ،انسان اور انسانیت کا گم ہو جانا اور مسخ شدہ اعمال کا چارسو پھیلے چلے جانا عہد جدید کا ایسا المیہ ہے جس نے یقین کے بجائے شک اور خوف کو جنم دیا۔حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں کھوئی ہوئی تہذیبوں اور روایتوں کو پیش کیا۔ اپنے افسانوں میں فلسفیانہ انداز میں مذہبی اور اخلاقی قدروں پر بحث کرتے ہوئے حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں۔

حیدر قریشی کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:''حیدر قریشی اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے بیشتر مظاہر کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اسی لیے ان کے ہاں زمینی خوشبو،عصری تازگی ، نئے تخلیقی رویہ اور برتاؤ کی توانائی ملتی ہے۔حیدر قریشی اپنے افسانوں میں نئے موضوعاتی پھیلاؤ کے ذائقوں ، رنگوں اور پہلوؤں کو سمونے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔''(۹۳)افسانہ''میں انتظار کرتا ہوں''،''انکل انیس''،''غریب بادشاہ''،''گلاب شہزادے کی کہانی ،اس نوعیت کے اچھے افسانے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو۔
''اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحرِ ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی ،
آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور مری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی۔۔۔۔۔

.............................................

۹۳۔ نذیر فتح پوری، سنجے گوڑ بولے (مرتبین)، حیدر قریشی فن اور شخصیت، پونہ: اسباق پبلی کیشنز۲۰۰۲ء،ص ۱۰۹۔

سب مری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔
سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جارہی ہے
اوراس آگ کے دوسری طرف میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اورخوف سے اس منظرکو دیکھ رہے ہیں۔
میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔
میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح مرے سامنے پیش ہوں گے۔''

**( میں انتظار کرتا ہوں )**

''قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہوسکتا۔
ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔''
''یہ ٹھیک ہے۔لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جارہا ہے،اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے''
''یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں،کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے۔''
''بابا!اس میں کلچر کا کیا کمال ہے۔یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔جغرافیے کا کمال ہے۔
یہاں کی مٹی، یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب وہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے
اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہوگئی ہے''۔ **(غریب بادشاہ)**

افسانہ''انکل انیس'' معاشرے میں اچھے کام کی آڑ میں ہو رہی برائیوں کی مثال پیش کرتا افسانہ ہے۔کس طرح عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے والے اسی کی آڑ میں عورتوں کو ضرورت کا سامان سمجھتے ہیں۔دوسرے معاشرے میں عورتوں کی غلط تصویر پیش کرنے والوں میں صرف مرد حضرات ہی نہیں ہیں بلکہ عورتیں خود اپنی بے عزتی کرتی اور کرواتی ہیں۔

''میں جنس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتا ہوں۔
معاشرتی حدود میں رہ کر اس کے تقاضے پورے ہوں تو زیادہ بہتر ہے
لیکن اگر کوئی ان سماجی حدود کو باہمی رضامندی اور خاموشی سے پھلانگتا ہے
تو میں اس پر بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔
ہر کسی کی اپنی زندگی ہے کوئی جیسے چاہے بسر کرے۔

میں دو دن لاہور رہا۔اس دوران میں انکل انیس سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔
میں نے مسز توصیف یا انکل انیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ مجھے ان کے ناجائز مراسم کا علم ہو گیا ہے۔''
''آپ ناراض ہو ہی گئے ہیں تو جاتے جاتے یہ کڑوا سچ بھی سن لیجئے کہ خواتین کے لئے اتنے حقوق مانگئے جتنے آپ اپنی ماں' بہن' بیوی اور بیٹی کو دے سکیں۔کیا آپ اپنی ماں' بہن' بیوی یا بیٹی کو یہ حق دیں گے کہ وہ کسی اور انیس صاحب کے ساتھ اسی طرح دورے کریں۔''

( انکل انیس )

افسانہ ''مسکراہٹ کا عکس'' ایک الگ نوعیت رکھتا ہے۔حیدر قریشی کا یہ افسانہ جرمنی میں لکھا گیا ان کا پہلا افسانہ ہے۔اپنی روایت سے جڑے ہونے کا احساس حیدر قریشی کی تمام تر تخلیقات میں نمایاں ہے۔اس افسانہ کی تخلیق ان کے گھر سے ہوئی ہے۔عارف فرہاد صاحب کو دیے گئے انٹرویو کا وہ اقتباس یہاں نقل کیا جا رہا ہے تا کہ بات واضح ہو سکے:

عارف فرہاد: اس سے پہلے بہت سے احباب آپ سے پوچھ چکے ہیں،آپ نے پہلے شاعری کی یا نثر لکھی، میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جرمنی آ کر آپ نے پہلی غزل، پہلا افسانہ یا پہلا تحقیقی یا تنقیدی کام جو کیا اس کی تفصیل کیا ہے؟

حیدر قریشی: یہ حساب کتاب والی بات تو اب بالکل ذہن میں نہیں ہے لیکن یادداشت کے سہارے جو کچھ فوری طور پر ذہن میں آ رہا ہے پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ یادوں کے ساتھ یا اپنی روایت کے ساتھ جڑنے کی چیز جو تھی وہ بڑی شدت کے ساتھ یہاں آ کر ظاہر ہوئی۔۔۔۔۔پہلا افسانہ مجھے یاد ہے، میں نے ''مسکراہٹ کا عکس'' لکھا تھا۔یہ وہ افسانہ ہے جس میں میری خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری ایک دوسرے میں ضم ہو گئی ہے۔اس افسانہ کا مرکزی کردار میرے والد صاحب ہیں۔''اوراق'' میں چھپا تھا یہ افسانہ اور آغا جی نے بہت پسند کیا تھا اسے۔اس کے باقی کے کردار میرے تینوں بیٹے ہیں اور میں۔یعنی یہ وہ افسانہ ہے جو یہاں آنے کے بعد مجھ سے لکھا گیا۔اس میں بھی اپنی مقامیت کے ساتھ وابستہ رہنے کی ایک خواہش تھی۔(۹۴)افسانہ مسکراہٹ کا عکس سے مثال ملاحظہ ہو۔

''ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی ابا جی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ٹیپو ابا جی کی گود میں تھا اور زلفی' شازی' اُن کے دائیں بائیں۔۔۔۔
مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔میں تصویر میں موجود نہیں تھا۔لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔
سو اس تصویر میں اپنی موجودگی' اپنی شرکت کا احساس جاگا۔اپنے تینوں بیٹوں اور ابا جی کی تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہو گیا' مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی' حال اور مستقبل تینوں زمانے یکجا ہو گئے ہیں۔ (مسکراہٹ کا عکس)

---

۹۴۔ سعید شباب،(مرتب)،انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی،۲۰۰۴ء،ص،۱۶۵۔

افسانہ ''مسکراہٹ کا عکس'' نئی اخلاقیات کی جستجو کو پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ موجودہ دور کی اچھائی اور برائی کے سیاق میں نئی فکر پیدا کرتا ہے۔جس سے دین اور دنیا کو سمجھا جا سکے۔افسانہ نگار اپنے ذاتی تجربے سے قاری کو آگاہ کرنا چاہتا ہے۔حیدر قریشی اس افسانہ کے ذریعہ باپ اور بیٹے کی نصیحت کو آنے والی نسل تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں

اور ابا جی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں

اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں ابا جی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔

میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔

مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔

نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔ (مسکراہٹ کا عکس)

## عدم پہچان کا مسئلہ:

جبر، خوف اور دہشت نے جدید عصری انسان کو جس بھیانک مسئلہ سے دوچار کیا ہے وہ عدم پہچان کا مسئلہ ہے۔ایسا اس لیے ہے کہ فرد اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔انسان اپنے ہی ہم جنسوں کے ہاتھوں ذلیل اور رسوا ہو رہا ہے۔خود پرست، مادہ پرست، خودغرض، لالچی، جابر، مغربی یا مغرب زدہ برسر اقتدار طبقہ، جنہوں نے عالمی گاؤں بنایا اور خود اس عالمی گاؤں کے سرپنچ بن بیٹھے، مواصلات کا انقلاب، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی یلغار، معاشی غلامی، عالمی منڈی، مذہبی وغیر مذہبی منافرت، دہشت گردی، تشدد، ایٹم بم کا ہراس، قاتل بیماریاں، کینسر، ایڈز، معاشی دہشت گردی، مغرب کا مخصوص معاشی خوف ان سب نے عصری انسان کو اتنا حقیر بنا دیا ہے کہ انسان لامحالہ دہشت، عدم تحفظ، غصہ، رنج، مایوسی، بربادی یہاں تک کہ عدم پہچان کا شکار ہو چکا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں شناخت کی گمشدگی کے کرب کو موضوع بنایا۔''شناخت''، ''میں انتظار کرتا ہوں''، ''روشنی کی بشارت''، ''ایک کافر کہانی''، ''روشن نقطہ'' ایسے ہی افسانے ہیں۔افسانہ 'میں انتظار کرتا ہوں' میں وقت کا ٹتا ہوا احساس ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ایک واحد فرد جس کی پہچان وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔افسانہ مختلف زمانوں کے کرداروں کے احساسات کا فرق ظاہر کر کے اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ ہر زمانے کی حیثیت جداگانہ ہے۔تبدیل ہوتے واحد فرد کے ساتھ اس کے ساتھ معاشرے کا کیا رویہ رہا ہے اسے

تاریخی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ہر چیز اپنا وجود کھو رہی ہے۔'میں انتظار کرتا ہوں' کا 'میں' ہزاروں سال پہلے سے یہ سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ آپس کا تعلق مشینی زندگی کی نذر ہو چکا ہے۔اس افسانہ کا کردار اپنی شناخت کے مسئلہ میں گرفتار ہے۔مثال۔

''میں پھر سوچنے لگتا ہوں
میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
ابراہیم کا بیٹا ہوں اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت
رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔
اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔
میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے
اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں''

( میں انتظار کرتا ہوں )

حیدر قریشی کا ایک دلدوز افسانہ ''شناخت'' ہے جو دراصل عورت کی شناخت کی کہانی ہے۔افسانہ کا پس منظر سیاسی ہے۔مصنف نے ملک کے بٹوارے کے بعد چاروں طرف پھیلی درندگی کو افسانہ کی بنیاد بنا کر انسانی شناخت کے عالمی المیہ کو پیش کیا ہے۔جو عہد حاضر میں ایک اہم المیہ بن چکا ہے۔افسانہ کی ابتدا مذہبی انتہا پسندوں کے کھیل سے ہوتی ہے۔ایک زُوردار دھما کہ ہوا۔ پاکستان آزاد ہو گیا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا۔ بچے، بوڑھے 'عورتیں سب گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔رشیدہ مسلمان لڑکی تھی اور پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ جانتی تھی۔وہ اپنے قافلے' اپنی ماں کی تلاش میں بھٹک رہی تھی کہ سکھ بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اسے ایک خالی مکان میں لے گئے۔

''لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔
تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پھر پاکستان پہنچایا جائے۔
تب سکھ لیڈر نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں' پرکاش کور ہے۔
کیونکہ اب وہ مسلمان نہیں' سکھ ہے۔
تکلیف اور اذیت کے عالم میں ''پاکستان زندہ باد'' ''جیئے ہند'' اور ست سری آ کال کے سارے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس

کا نیا نام یاد کراتے رہے۔

وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔

تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہوگئی اور اسے یقین آ گیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں' پرکاش کور ہے۔

اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔ لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی۔'' (شناخت)

مذہب کی آڑ لے کر اپنی ہوس مٹانے والے لوگ معاشرے میں دیمک کی طرح پھیل چکے ہیں۔ان کے دل اس بات سے ذرا برابر نہیں کانپتے کہ وہ کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔کسی سے اس کی شناخت چھین لینا، مذہب اور ملک دونوں کی نظر میں بہت بڑا گناہ ہے۔گناہ کرنے والا گناہ کی لذّت لے کر آگے بڑھ چکا ہے لیکن رشیدہ لاچار ہے' بے بس ہے' وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

''اس کے اندر کی رشیدہ اس سے گزرے ہوئے' بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔

کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔

سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گوروگوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ'

پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلیدستان۔۔۔وہ تو اپنا مطلب' اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔

اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک نئی معنویت پیدا کر دی۔دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی۔۔۔

لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی' اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی۔

اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے' بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آ گئی''

( شناخت )

حیدر قریشی نے اس لرزہ خیز افسانہ میں دکھلایا ہے کہ وقت کس طرح خود کو دہراتا ہے اور تاریخ کس طرح کروٹ لے کر اصل رُخ دکھلاتی ہے۔'شناخت'' میں ایک نیا دھماکہ ہوتا ہے اور اندرا گاندھی قتل کر دی جاتی ہیں۔چونکہ ان کا قتل ایک سکھ نے کیا تھا اس لئے اس کا ردِعمل ہوتا ہے اور انتہا پسند ہندوؤں کو کھل کر کھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔سکھوں کا قتلِ عام شروع ہو جاتا ہے سکھ لیڈر سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا کہ بلوائیوں نے اس کے گھر کی دہلیز پر اس کے دونوں جوان بیٹوں کو قتل کر دیا اور گھر کو آگ لگا دی۔رشیدہ یا پرکاش کور اپنی جوان بیٹی کے ساتھ گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر باہر نکل جاتی ہے۔

''اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔
چترا ایک مکان کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی۔
آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو باری باری ریپ کررہے تھے۔۔۔۔'' (شناخت)

عورت کیا ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے، اس کا وجود کیا ہے۔ باپ، بھائی اور شوہر کی صورت میں تحفظ دینے والا مرد یا معاشرے میں آزادانہ طور پر گھوم رہے بھیڑیوں کی شکل میں موجود مرد صحیح معنوں میں عورت کی شناخت کوئی نہیں کرسکا۔ افسانہ نگار افسانہ میں عورت ہونے یا لڑکی ہونے کی لاچاری کو سوالیہ نشان کے طور پر بیان کرتے ہوئے افسانہ کا اختتام ان الفاظ میں کیا۔

''وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ ایک عورت ہے۔ یہی اس کا نام ہے یہی اس کا مذہب ہے''

## ایٹمی جنگ:

بیسویں صدی کے نصف آخر میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پوری دنیا تغیر و تبدیلی کے ایک تیز رفتار بہاؤ کی زد میں تھی۔ نت نئی ایجادات سے دنیا کے لیے ایک نئی اصطلاح عالمی گاؤں وجود میں آئی۔ تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم ہونے لگیں۔ پیسے کا حصول انسان کی سوچ کا محور بن گیا۔ دہشت گردی، حکومتوں کا عدم استحکام، اقتدار کے لیے سیاسی بازیگری اور دیگر معاملاتِ زندگی نے ہر حساس فرد کی طرح حیدر قریشی کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے دنیا بھر میں وقوع پزیر ہونے والے بھیانک واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ افسانہ'' حوا کی تلاش''،'' گلاب شہزادے کی کہانی''، کاکروچ'' ایٹمی جنگ کے موضوع پر لکھا گیا بہترین افسانہ ہے۔ افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' اور'' حوا کی تلاش'' مجموعہ'' روشنی کی بشارت'' میں شامل اہم افسانہ ہے۔ '' حوا کی تلاش'' مجلّہ'' اوراق'' لاہور شمارہ فروری، مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔'' گلاب شہزادے کی کہانی''،'' اوراق'' کے شمارہ اپریل مئی ،۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ افسانہ'' کاکروچ'' مجموعہ'' قصے کہانیاں'' میں شامل ہے جو ۱۹۹۲ء میں ماہنامہ'' صریر'' کراچی شمارہ فروری میں بھی شائع ہوا۔ ایٹمی جنگ کے متوقع خطرے کا ادراک کرکے اس کے انسانی زندگی پر اثرات اور ایٹمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کو ان افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں حیدر قریشی خود لکھتے ہیں:

۱۹۸۰ء کے وسط میں میرا ذہن بار بار ایٹمی جنگ کے امکانی خطرہ کی طرف جاتا تھا۔ بعض آسمانی صحیفوں اور مذہبی

کتب میں مجھے ایک بڑی تباہی کی خبریں ملیں تو میرے اندر بے چینی نے مجھ سے کہانی ''حوا کی تلاش'' لکھوائی۔۔۔۔''حوا کی تلاش''، ''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ''۔ یہ تینوں کہانیاں کرۂ ارض پر انسانیت کو درپیش ایٹمی تباہی کے بارے میں میرے احساس اور میری تشویش کی کہانیاں ہیں۔(۹۵)

یہ تینوں افسانے اپنے تسلسل اور ربط کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانہ ''حوا کی تلاش'' میں حیدر قریشی ایٹمی جنگ کے اثرات و واقعات کو موضوع بناتے ہیں۔ اس افسانہ میں حیدر قریشی نے خود کو ایٹمی جنگ کے متاثرین کے روپ میں پیش کیا ہے۔

''ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے اور اب ابن آدم ہونے کے ناطے اس وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا جائے۔
شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔'' **(حوا کی تلاش)**

افسانہ ''حوا کی تلاش'' میں حیدر قریشی نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز کی بدولت یہاں تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے ایٹمی جنگ کی پیشن گوئیوں کی وضاحت اس طرح کی ہے۔:

''جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی اور انسان کہہ اُٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟''

''اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہوگا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت و خون ہوگا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ ایک عالمگیر تباہی آوے گی۔۔۔۔''

**(حوا کی تلاش)**

افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' میں افسانہ نگار نے ایک ایسی فضا قائم کی جو بیمار روحوں کی ہے۔ جہاں کے رہنے والوں کے سینے ہوس سے بھرے پڑے ہیں۔ تمام عالم انسانیت پر حکومت کرنا جن کا خواب ہے۔ افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' نفس امارہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ نفس امارہ، جھوٹ، دغا، فریب، دھوکہ، قتل، خود غرضی، ہوس، غرض جتنے بھی غیر اخلاقی کام ہوں ان کی طرف لے جانے والا نفس ہے۔ جو کہ پورے افسانہ پر غالب ہے۔ افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' کی دنیا عصرِ حاضر کے حالات، واقعات اور امکانات سے رونما ہوتی ہے۔ افسانہ میں جو کرب ہے وہ محض خارجی نہیں بلکہ اس اذیت کے سوتے ان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

..............................

۹۵۔ حیدر قریشی، ایٹمی جنگ، دہلی: معیار پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء، ص ۴۔

صحرا میں رات کا ایک پہر گزر نے کے بعد بھی چاروں درویشوں میں سے جب کسی کو نیند نہیں آئی تو رات کاٹنے کے لیے یہ طے پایا کہ سب اپنی اپنی کہانی سنائیں گے ۔نیند کا نہ آنا بھی موجودہ دور کا ایک بڑا المیہ ہے۔ پہلا درویش گلاب کی قلم کو ریت میں گاڑ کر اس کے بڑھنے کا انتظار کرتا ہے۔یعنی کہ ابتدا میں ہی وہ کھلا اعلان کرتا ہے کہ اس میں جذبات کی نمی موجود نہیں ہے،اس کا دل ریت کی طرح بنجر معلوم ہوتا ہے اور اسے گلاب کی قلم کو پودے میں تبدیل ہونے تک کے لیے دوسروں کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہاں افسانہ نگار قاری کی توجہ موجودہ انسانی معاشرہ کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ یہ دور درندگی اور جبر کا معاشرہ ہے۔ یہ ایسا دور ہے جہاں خود جینے کے لیے کسی دوسرے کو مارنا پڑتا ہے۔جدید معاشرتی زندگی نے عصری انسان سے دوستی اور رشتے ناطے چھین لیے ہیں اور ان کی جگہ کاروباری تعلق نے لے لی ہے۔ ہر طرف کھوکھلا پن اور منافقت ہے۔

زیرنظر افسانہ رنگ کی بنیاد پر انسانی فطرت کو علامتی پیرائے میں بیان کرتا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے۔رنگ جو اپنے اندر تمام تر کائنات کو سمیٹے ہوئے ہیں، یہاں افسانہ نگار نے رنگوں کو ایک نئی جہت دی ہے۔شروع افسانہ میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔

گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔''

**(گلاب شہزادے کی کہانی)**

دورانِ مطالعہ یہ بات مجھے شدت سے محسوس ہوئی کہ افسانے میں شامل یہ جملہ سب سے زیادہ تہہ دار ہے۔اس ایک جملہ میں پورا افسانہ سمٹ کر آ گیا ہے۔گلابی،سرخ،سفید اور سیاہ چاروں رنگ اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہیں۔گلابی رنگ رومانیت کا،سرخ رنگ خون کا،سفید رنگ موت کا اور سیاہ رنگ طاقت ،حکومت اور خوف کا استعارہ ہے۔جیسے جیسے افسانہ تشکیل پاتا ہے رنگ اپنا معنی خود بخود بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔افسانہ میں تیسرے درویش کی کہانی کا موضوع خاندانی منصوبہ بندی ہے۔اپنی ناجائز تمناؤں اور ہوس کو پورا کرنے کے لیے آج کے انسان نے جسے فیشن بنا رکھا ہے۔فیشن کے نام پہ ہو رہی برائیاں سماج میں جڑ پکڑ چکی ہے۔چوتھا درویش جو درحقیقت پہلا درویش ہوتا ہے اپنے بھائی کو مار کر اس کی دولت پر قبضہ کرنے کا خواہش مند ہے۔اس کی یہ خواہش اور ہوس اس حد

تک پختہ ہو چکی ہے کہ پانی کو تیل سمجھ بیٹھتا ہے اور پیاسا ہی مر جاتا ہے۔ وہ اپنے خواب کو اپنے دوست کے نام سے بیان کرتا ہے۔

یہ کہانی دراصل میری نہیں۔ میرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسی کی زبان میں بیان کروں گا۔

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ (گلاب شہزادے کی کہانی)

کہانی ختم ہونے کے بعد پہلا درویش جس حیرت کا اظہار کرتا ہیاس سے اس کی مکاری ظاہر ہوتی ہے۔ تیل کی دولت وہ خزانہ ہے جس پر پہلا درویش اپنی حکومت قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس واقعے کے پردے میں سیاسی رنگ کا عکس مکمل طور پر نظر آتا ہے۔

''پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

ہاہاہا۔۔۔۔اب اس صحرائی علاقے کے تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔

ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے سب مری رعایا ہیں۔۔۔

اور میں اس نئے عہد کا حکمران۔۔۔عظیم حکمران۔۔۔ہاہاہا۔۔''

(گلاب شہزادے کی کہانی)

افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ موجودہ دور میں اخلاقی برائیاں ہمارے روٹین میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کا انسان گناہ کرنے کے بعد بھی خود کو گنہگار تسلیم نہیں کرتا، مشینی زندگی نے انسانی رشتوں کی معنویت کو ختم کر دیا ہے۔ اسی لیے ہمیں اپنے گناہوں کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی غلطیاں بالآخر انسان کو موت کی طرف لے جاتی ہے۔

''گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا!

افسانہ ''کاکروچ'' بھی ایٹمی جنگ کے موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن اس افسانے میں حیدر قریشی نے ایٹمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو اپنے تخلیقی شعور سے بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسانوں سے ہوتا ہے

میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کر دیتے ہیں۔

میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی ہے۔۔۔۔۔
میرے پوتے، پوتیاں اور نواسے نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل اور پتھر کے دور میں آ گیا ہے''۔
**(کاکروچ)**

افسانہ''کاکروچ''میں مذہبی تصورات کی بجائے سائنٹفک نظریات کو پیش کیا ہے۔جدید سائنس نے نہ صرف یہ کہ ایٹم کی تباہ کاری کا عبرت انگیز منظر دیکھا بلکہ اس نے اس کی تباہی کے مزید کئی اسرار بھی منکشف کیے ہیں۔قاری کے لیے ایک نئی سوچ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔حیدرقریشی کے اس منفرد اور مفکرانہ انداز کے بارے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقم طراز ہیں۔''حیدرقریشی کے افسانے میں تجربے کا نقش ہے، مشاہدے کی باریکی ہے، زندگی کے فلسفے کی جھلک ہے اور اشارات و کنایات ہیں۔ساتھ ہی تفہیم کی فکر نمایاں ہے۔بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچویشن میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات سے اثر کو تلاش کرے۔''(۹۶)

## مذہبی موضوعات:

وحدت الوجودی رجحانات حیدرقریشی کا خاص موضوع رہا ہے۔وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ وجود صرف واحد ہے۔چشم ظاہری سے جو نظر آتا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں، کائنات میں سب اسی وجودِ واحد کا جلوہ ہے۔ہر مذہب میں وجودِ باری تعالیٰ کو کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کیا گیا ہے اور سماج میں کچھ ایسے لوگ بھی ضرور ہیں جو اہلِ باطن ہوتے ہیں۔حیدرقریشی بھی ان میں سے ایک ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے دنیا میں ختم ہوتی ہوئی مذہبی قدروں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔وہ معاشرے میں ہونے والے مکروہات سے بچانے کے لیے روشنی کی بشارت دیتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں دین، دنیا، محبت اور خدا کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔قارئین کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرتے ہیں۔بقول دیویندراسّر۔

حیدرقریشی کی کہانیاں کائنات، انسان۔خدا۔روح۔ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ایسی کہانیاں اُردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔کسی ایک مصنف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آ جائیں گی لیکن کوئی ایک ہی مصنف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیات سے جوجھتا رہے، ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں ہے۔۔۔۔۔
حیدرقریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں۔(۹۷)

---

۹۶۔ نذیر فتح پوری، سنجے گوڑبولے (مرتبین)، حیدرقریشی فن اور شخصیت، پونہ: اسباق پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء ص ۹۵۔
۹۷۔ دیویندراسر رائے، افسانے، دہلی: معیار پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء ص ۱۵۴۔۱۵۵۔

''ایک کافر کہانی''، ''روشن نقطہ''اس موضوع کی مکمل عکاسی کرتی ہوئی کہانیاں ہیں۔افسانہ''روشن نقطہ'' میں روشن نقطہ استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اس افسانہ میں حیدر قریشی محبت کو سمجھنے کے لیے زماں ومکاں کے چار علم میں زندگی کے اصل مقصد کو تلاش کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

''محبت کے چار سفر ہیں۔کامیابی کے لیے یہ سفر ضروری ہیں۔
محبّ سے محبوب کی طرف۔محبوب سے محبّ کی طرف
محبّ سے محبّ کی طرف۔محبوب سے محبوب کی طرف'' **(روشن نقطہ)**

حیدر قریشی محبت کے اس سفر میں دین اور دنیا کو سمجھنے کا درس دیتے ہوئے عوالم الٰہی کو بھی چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

''پہلا عالم، عالم زمان ہے۔یہ ایسا عالم ہے جس کی ابتداء اور انتہا دونوں معلوم ہیں
دوسرا عالم، عالم دہر ہے۔اس عالم کی ابتداء معلوم مگر انتہا نامعلوم ہے
تیسرا عالم، عالم سرمد ہے، اس کی ابتداء بالکل نظر نہیں آتی مگر انتہا سمجھ میں آتی ہے
چوتھا عالم، عالم ازل ہے۔اس کی نہ ابتداء کا پتہ ہے نہ انتہا کی خبر ہے'' ۔ **(روشن نقطہ)**

''ایک کافر کہانی'' وحدۃ الوجودی فلسفے پر مبنی ہے۔مذہب کو انسان کے لیے لازمی خیال کیا گیا ہے ۔اس کہانی کا بنیادی موضوع انسان کی عظمت ہے۔افسانہ نگار نے کائنات میں سب سے اہم انسان کو مانا ہے۔

انسان زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اس لیے وہ صفاتِ خداوندی کا عکاس اور مظہر ہے۔حیدر قریشی کی رائے میں انسان اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنی خدا داد صلاحیتوں اور قدرتِ تسخیر کی بدولت کائنات کی دیگر تمام مخلوقات سے افضل واعلیٰ ہے۔

''عرش کیا ہے؟
فرمایا''میں ہوں''
''لوح وقلم کیا ہے''
فرمایا''میں ہوں''۔۔۔۔۔
تب فرمایا

''جوشخص حق میں محو ہو جاتا ہے اور جو کچھ حق ہے اگر ایسی صورت میں وہ سب کچھ ہو تو کوئی تعجب نہیں ۔''

**(ایک کافر کہانی)**

حیدر قریشی نے تاریخی اور اساطیری موضوعات پر بھی افسانہ لکھا۔افسانہ ''بھید'' میں اللہ والی جنت بی بی کے خواب کا واقعہ بیان کیا ہے۔اس افسانہ میں حضرت ابو عبداللہ جلاؒ اور حضرت حسن بصریؒ جیسے بزرگوں کے روحانی تجربات کا واقعہ ہے اور خود مصنف پر منکشف ہونے والی واردات کا بھی ذکر ہے۔

''تب میں شوگر ملز میں ملازم تھا۔دسمبر کے آخری دن تھے۔

اُس شام کو میری چھ بجے سے رات دو بجے تک والی شفٹ تھی۔

جب میں ڈیوٹی کے لئے جا رہا تھا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔میں نے لیبارٹری میں بہ مشکل دو گھنٹے کام کیا تھا کہ بخار تیز ہو گیا۔

اپنے معاون کو اپنی ڈیوٹی سونپ کر میں لیبارٹری کے متروک ڈارک روم میں چلا گیا۔

وہاں فلٹر کلاتھ کا صرف ایک ٹکڑا پڑا تھا' جسے میں نے بچھونا بنالیا' سرہانے ایک اینٹ رکھی اور سکڑ کر لیٹ گیا۔جیسے جیسے بخار چڑھ رہا تھا ٹھنڈک کا احساس بڑھ رہا تھا۔اوپر کوئی رضائی' کمبل یا چادر نہ ہونے کے باعث کپکپی ہونے لگی تھی۔

اچانک ایسے لگا جیسے کسی نے آکر میرے اوپر رضائی ڈال دی ہو اور پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔

رات ڈیڑھ بجے جب چھٹی کا پہلا سائرن بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔میرا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا۔بخار ٹوٹ چکا تھا۔

میں نے اپنے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو ایک طرف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔مگر یہ کیا؟ ڈارک روم میں کسی رضائی کا نام ونشان نہ تھا۔

یہ کیا بھید تھا؟۔۔۔۔۔پہلے تجربے کے پورے بیس سال بعد کل رات پھر ایک انوکھی واردات ہو گئی ہے۔۔۔۔

**(بھید)**

اسلامی اساطیر کے ہی سلسلے کا ایک افسانہ ''بابا جمالی شاہ کا جلال'' ہے۔مثال۔

''مغلیہ دور میں جب ایک اہم مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہو گیا۔مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز سے کہا:'جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے' مغل بادشاہ' اُن کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔

نماز کے بعد اس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اس نے بڑی سادگی سے کہا:

''میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو۔میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔

بادشاہ کے حکم سے اُسی وقت وہاں کی کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اس مجذوب نے کہا:

''نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔
ظلِ الٰہی بہ نفس نفیس حاضر ہیں۔کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔۔۔۔اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔مجذوب نے یہ بات کہی اور یہ جا' وہ جا۔۔۔بادشاہ اور درباری حیران اور امام صاحب شرمندہ و پریشان۔''

**( بابا جمالی شاہ کا جلال )**

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی اپنے مضمون ، میں یوں لکھتے ہیں۔'' حیدر قریشی کے افسانوں میں تاریخی حقائق کی جھلک اور مشاہدات کی مہک ہے ۔ مذہبی افکار وعقائد کے اظہار میں ان کا وہ فنی سلیقہ بھی نمایاں ہے جو انھیں خطیب ہونے کے الزام سے بری کرتا ہے۔''(۹۸)افسانہ نگار مذہب کے روحانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ زمینی تمدن کو بھی انسانی حیات کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

''میں تمہاری وجہ سے جنت بدر ہوا تھا مگر اب میں تمہاری وجہ سے زمین بدر نہیں ہوسکتا''۔ **(اندھی روشنی)**

''لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہوگیا۔وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔''

**(گھٹن کا احساس)**

''پچھلی بار میں دس سال بھٹکنے کے بعد اتھا کا پہنچا تھا،اس بار مجھے علم ہے کہ میں اس مدت سے کہیں پہلے اپنے اتھا کا پہنچ جاؤں گا۔
لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے
ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔
اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔
آنکھیں کھلی ہوں تو ''دیکھنے'' کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے پھر اسے رقم کرنا ہے۔
مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہر یا شدید تھپیڑا مجھے اتھا کا پہنچا دے گا جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میرا انتظار کر رہی ہے۔''

**(۲۷۵۰ سال بعد)**

............................................

۹۸۔ نذر خلیق، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳،ص ۲۰۲۔

دیوندر اسّر اپنے مضمون میں حیدر قریشی کی کہانیوں پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں جو واقعاتی تسلسل اور کہانی پن پر مبنی ہو کر سوال، شک اور فکر کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشہ گھر تعمیر کرتی ہیں۔اس شیشہ گھر میں ہم داخل ہونے کے لیے آزاد ہیں۔لیکن اس سے باہر نکلنے کے راستے بند ہیں۔صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے ہمارے دل کا۔۔۔۔جس کے ساتھ ساتھ چل کر ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا منتظر ہے۔ جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں۔(۹۹)

## انسان دوستی:

انسان دوستی تصوف کا خاص وصف ہے جسے حیدر قریشی نے اپنی کہانیوں میں موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اپنا مکمل نظریۂ حیات تلاش کرتے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری سے ہٹ کر انسان دوستی کا نظریہ ان کے افسانوں کا وصف ہے۔حیدر قریشی اس انسان دوستی کو انسان کے تمام مسائل کا حل مانتے ہیں۔کھلے دل سے اپنے باطن کا اظہار، خود پر ہنسنے اور طنز کرنے کا حوصلہ، خوشی وغم، دکھ سکھ، بلندی وپستی کو ایک ساتھ رکھنے کا عمل ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔''غریب بادشاہ''، ''گھٹن کا احساس''، ''کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار'' اس ضمن کے افسانے ہیں۔

''کیا تمہیں پتہ ہے میں اپنے مذہبی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں
کے مذہبی تہوار بھی اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ مناتی ہوں۔کرسمس، بیساکھی، دیوالی......''
''یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو۔''

(افسانہ ''غریب بادشاہ)

''انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیئے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنالئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔
یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔
جیتے جی قبر میں گرانے والی، اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔

..........................................

۹۹۔ نذر خلیق، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳،ص ۱۹۹۔۱۹۸۔

اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔''

(افسانہ ''گھٹن کا احساس'')

''پھر وہ رات، جب تک دونوں جاگتے رہے، دادا نے پوتے سے کہانیاں سننے میں گزار دی۔
اور اسی رات کہانی کار نے سوچا کہ اپنی ادھوری کہانی میں کسی امتیاز کے بغیر ہر مذہب و مسلک کے سارے کے سارے انتہا پسندوں کو ایٹمی جنگ سے ہلاک کر کے صرف اپنے پوتے جیسے انسانوں کو بچایا جائے اور انہیں کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھر سے دھرتی پر آباد کیا جائے۔
لیکن ابھی یہ صرف کہانی کار نے سوچا ہے،
کہانی لکھتے وقت کیا روپ اختیار کر جائے! اس کا تو خود کہانی کار کو بھی علم نہیں ہے۔''

(کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار)

حیدر قریشی کے افسانوں کے اس موضوعاتی جائزہ سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ موضوعات پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور ان کے یہاں موضوعاتی تنوع بھی ہے۔ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے حیدر قریشی نے اپنی علمی بصیرت کو ادبی دنیا میں تسلیم کرایا۔ انہوں نے ایک خوش اسلوب نثار کی طرح اہم علمی و فکری موضوعات کے علاوہ سماجی و معاشرتی مسائل پر پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا۔حیدر قریشی نے اپنے عہد کے منظر نامہ کو افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔مختصر یہ کہ حیدر قریشی کے ادبی، سماجی اور سیاسی تجربے اپنے عہد کا نچوڑ ہیں جس کی ترجمانی انہوں نے افسانوں میں وسیع پیمانے پر کی ہے۔

# باب۔۴

# حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا فنی تجزیہ

فنی طور پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کا زمانہ خارجی حقیقت نگاری اور سادہ بیانیہ کا دور ہے۔۱۹۶۰ء کی دہائی میں افسانہ جس نئے مزاج سے آشنا ہوا، اس کے پس منظر میں اردو افسانے کی ایک بڑی روایت موجود ہے۔منٹو کو اردو افسانہ کی ایک بڑی روایت کا نمائندہ مانا گیا۔منٹو کی موت کے ساتھ ہی یہ روایت اختتام پزیر ہوئی۔لیکن یہ خیال کیا گیا کہ منٹو نے ''پھندنے'' لکھ کر ایک نئی روایت کی بنیاد رکھ دی تھی۔انجمن ترقی پسند مصنفین پر لگنے والی پابندی نے پاکستان میں ترقی پسند فکر کو منشور کی قید سے آزاد کر دیا، جس وجہ سے ترقی پسندوں کی اکثریت حلقہ کے جلسوں میں آنے لگی، یوں فکر وفن کا ایک بہتر امتزاج سامنے آیا۔مجموعی طور پر یہ دور افسانہ کے فنی جمود کا دور ہے۔فنی اور فکری تبدیلی کا عمل ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اس وقت سامنے آیا، جب لسانی تشکیلات کے حوالے سے جدید فنی وسائل میسر آئے جس نے کچھ ہی وقت میں اردو افسانہ نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

۱۹۶۰ء کا دور خیال کے گنجلک کا دور تھا۔یہ دور اسلوبیاتی تبدیلی کا دور تھا۔اس میں ادبی جمالیات نہ سہی لیکن نیا اظہار ضرور تھا۔افسانہ نگاروں نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو سیاسی اور ادبی سطح پر انتشار پھیلا ہوا تھا۔دانشور طبقہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔انسان دوستی، سماجی انقلاب اور معاشی مساوات کے بارے میں پرانے تصورات اور عقائد مٹ چکے تھے۔اقدار و عقائد کی شکست و ریخت نے اردو شعر و ادب پر گہرا اثر ڈالا اور جدید افسانہ اسی سارے ماحول میں پروان چڑھا۔جدید افسانہ نگاروں کا زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کا انداز انفرادی تھا۔جدید افسانہ نگاروں پر روشنی ڈالتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں: ''نئے افسانہ نگار کی خوبی اور برتری اپنے افسانوی مادے اور ہیئت کی پیچیدگی کو زیادہ سے زیادہ لطف اور جاندار بنانے میں ہے۔''(۱۰۰)

جدید افسانہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں سے مواد، ہئیت اور اسلوب کے اعتبار سے جداگانہ ہے۔اس کی بنیادی وجہ زندگی اور ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔جدیدیت اور اردو افسانے پر شہزاد منظر نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہتے ہیں:

> یہ درست ہے کہ جدید افسانہ کہانی بیان نہیں کرتا نہ اس کا کوئی متعین پلاٹ ہوتا ہے، جدید افسانہ میں پلاٹ کو ثانوی حیثیت ہوتی ہے۔اولیت مرکزی تصور اور فکر کو حاصل ہوتی ہے۔افسانے میں کردار، مناظر اور واقعات کی محض دھند ہوتی

.......................................

۱۰۰۔ مہدی جعفر، نئے افسانے کا سلسلہ عمل، گیا: نگارینہ حیدری برائے دی کلچرل اکیڈمی، ۱۹۸۱ء، ص۲۳۔

ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود کامیاب افسانہ کی پہچان یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا افسانے کے مرکزی خیال یا فکر سے گہرے طور پر متاثر ہو اور اس پر معنویت کی پرت کھل جائیں۔(۱۰۱)

۱۹۶۰ء سے پہلے عموماً افسانے میں ایک منظّم پلاٹ، نمایاں کردار، کہانی کی شکل میں کوئی خصوصی واقعہ اور زمان و مکان کے ساتھ مخصوص تاثر ضروری سمجھا جاتا تھا۔لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ان تمام نکات کے ہمراہ کئی نئی روایات افسانہ میں شامل ہوگئیں۔اس طرح جدید افسانہ قدیم روایتوں اور فنی تکنیک کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوگیا۔ اب کسی واضح پلاٹ، کردار یا تاثر کی ضرورت نہ رہی بلکہ افسانہ عہدِ حاضر کی حیران کن زندگی کا پیچیدہ استعارہ بن گیا۔ اور اسے علامتی افسانہ کہا جانے لگا۔علامتی افسانہ میں افسانہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کو اپنی داخلیت میں سمو کر دور رس لفظی پیکروں میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ زندگی کے ایک دو پہلو نہیں بلکہ کئی رنگ ایک ساتھ پھیلتے نظر آتے ہیں۔جدید افسانہ نگاروں میں شدید ردِعمل اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک کے دوران ادب میں اس نعرے بازی اور ادب کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کی مخالفت کی جانے لگی۔افسانہ نگاری کی قدیم روایات کو بھی رد کر دیا گیا۔افسانے کے مروجہ ہئیت اور فنی اصول کے خلاف بھی شعوری بغاوت کا آغاز ہوا۔حقیقت نگاری کے ردِعمل میں علامتی اور تجریدی اسلوبِ اظہار بتدریج بڑھ گیا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں۔

> ہمارا علامتی افسانہ ایک طرف تو بے رحم حقیقت نگاری کی روش سے انحراف کا عمل تھا۔دوسری طرف سیاسی جبر کی فضا میں سانس لینے کی ایک کاوش اور تیسری طرف (اور یہی سب سے اہم بات ہے) شے، کردار یا کہانی کے باطن میں موجود پراسراریت کا ادراک کرنے کے عالمی رجحان سے منسلک ہونے کا ایک اقدام تھا۔ہمارے جدید علامتی افسانہ نے بے حد نازک اور لطیف نفسی کیفیات اور معنی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔جو رومانی انداز یا حقیقت پسندانہ عکاسی کے مقابلے میں ایک نسبتاً مشکل عمل ہے۔۔۔۔۔علامتی افسانہ نے سائیکی کی گہرائیوں میں اتر کر کیفیات کو اور واردات کو مس کیا ہے اور یہ عمل گرامر میں جکڑی ہوئی زبان کے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ علامتی افسانہ خود کو حقیقت سے منقطع نہیں کرتا تاہم وہ خود کو حقیقت کی محض بالائی سطح تک محدود بھی نہیں رکھتا، بلکہ سدا شے یا کردار یا فضا کو بنیاد بنا کر دوسری جانب کی پراسراریت کو مس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جس کے باعث افسانہ میں معنی کے کئی پرت پیدا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔علامتی افسانہ لفظ کی قلب ماہیت کر کے اسے معانی کو گرفت میں لینے کے قابل بناتا ہے۔(۱۰۲)

---

۱۰۱۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ، کراچی: منظر پبلی کیشنز ۱۹۸۲، ص ۴۹۔

۱۰۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا، دائرے اور لکیریں، لاہور: مکتبہ خیال ۱۹۸۶، ص ۱۴۵۔۱۴۳۔

جدیدیت کی پرورش محدودیت، یکسانیت اور جبر کے ماحول میں ہوئی ۔نئے ذہن کے لیے اہم بات آزادی،خودمختاری اور بغاوت کے رویے تھے۔جدید ادیبوں نے اعلانیہ طور پر اپنے آپ کو غیر نظریاتی کہا اور کسی نئ و پرانی فکر میں الجھنے کی بجائے ادب کے فنی ڈھانچے کو اولیت دی ۔جدید افسانہ نگاروں نے ہیئت ،مواد اور اسلوب کے میدان میں نت نئے تجربے کیے۔کلاسیکی افسانے میں پلاٹ اور کہانی پن کے عناصر کو لازمی خیال کیا جاتا تھا۔کسی واقعے ،کردار مناظر فطرت سے کہانی شروع ہو کر ایک تسلسل کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچتی تھی ۔ابتدا، وسط اور اختتام کا خیال رکھنا اور پلاٹ کی چستی کو ایک فنی خوبی خیال کیا جاتا تھا۔جدیدیت کے نزدیک کہانی اور پلاٹ ساکت و جامد اشیاء نہیں ۔ضروری نہیں کہ ایک عہد میں پلاٹ اور کہانی کا جو انداز ہو وہ دوسرے عہد میں بھی برقرار رہے۔پلاٹ بذاتہ خود کوئی شے نہیں بلکہ اس کی حقیقت افسانے کی نوعیت سے مرتب ہوتی ہے۔کرداری و واقعاتی افسانے میں پلاٹ کی صورت مختلف ہوتی ہے اور احساس و خیال کے زور پر لکھے گئے افسانے میں مختلف جدید افسانہ نگاروں نے واقعات کے تسلسل کی بجائے خیالات کے تسلسل کو کہانی اور پلاٹ کا مترادف قرار دیا۔ان کے نزدیک افسانے میں کہانی پن تو بہر حال موجود ہوتا ہے لیکن اس کے لیے کسی متعینہ پلاٹ یا کسی منضبط تسلسل کی حیثیت ،صورتِ واقعہ پر منحصر ہے۔(۱۰۳)

افسانے میں افسانویت کہانی اور پلاٹ پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ بہت سے دیگر لوازم مل کر اس کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔کلاسیکی عہد میں افسانے کی افسانویت کی بنیاد کہانی ہی کو قرار دیا جاتا تھا۔واقعہ، ماجرا یا واردات کے بغیر نہ تو افسانے کا تصور ممکن تھا اور نہ ہی اس کیفیت کا جسے افسانے کے حوالے سے افسانویت کا نام دیا جاتا ہے۔جدید افسانہ نگاروں کے مطابق افسانویت کوئی بنی بنائی چیز نہیں اور نہ ہی اسے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے بلکہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔اب واقعاتی تسلسل کی بجائے خیال و احساس کے تسلسل کو اہمیت دی گئی ۔ظاہر ہے خیال و احساس کی حیثیت باطنی ہے اور باطن کی ترتیب و تنظیم اور آہنگ، خارج سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔

کلاسیکی افسانے میں کردار کے نقش و نگار واضح ہیں ۔ان کے مخصوص نام اور انفرادی خصوصیت ہے۔ان کی پہچان اپنے طبقے کے حوالے سے بھی ہے اور کسی مخصوص سوچ اور طرزِ عمل کے اعتبار سے بھی۔یہ کردار سانس لیتے اور

........................

۱۰۳۔ شفیق انجم ،اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں ،اسلام آباد، یورپ اکادمی ،۲۰۰۸ء ص ۴۴۲

اپنے شخصی وسماجی وجود کے ساتھ حرکت کرتے انسان کا ایک مکمل ڈھانچہ ہیں۔جدید افسانہ نگاروں نے کرداروں کی اس ہیئت کی جگہ نئے قالب تیار کیے اور انہیں نئی معنویت کے ساتھ نئے انداز میں پیش کرنے کی سعی کی۔جدید افسانے میں کرداری حوالے سے بنیادی تبدیلی جسم کی بجائے پرچھائیں کو ترجیح دینا ہے۔قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں معاشرتی الٹ پھیر اور منافقتوں وجعلسازیوں کی بدولت یہ المیہ نئی نسل کا مقدر بنا۔مارشل لاء کے نفاذ نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور سب سے بڑھ کر مغرب سے آمدہ انحطاطی فکری عناصر مجموعی طور پر لاتعلقی، اجنبیت اور مغائرت کا باعث بنے۔اس صورتحال میں کرداروں کا بے نام ہو جانا اور شناخت کی گمشدگی ایک فطری امر تھا۔جدید افسانہ نگاروں کے ہاں بے چہرہ کرداروں اور پرچھائیوں کی پیش کش عصری زندگی کے اسی المیے کی بازگشت ہے۔یہ پرچھائیں جدید افسانے میں کبھی تو اپنے آپ کو تلاش کرتی نظر آتی ہے،کبھی کسی دوسرے کے تعاقب میں چلتی ہے تو کبھی وجود کی تمنا میں مختلف قالب بدلتی چلی جاتی ہے۔کردار کا یہ عکس کبھی میں، وہ اور تم سے اور کبھی کسی تاریخی، اسطوری یا دیومالائی وجود کو اپنا سہارا بنالیتا ہے۔

کلاسیکی افسانے میں اسلوب سادہ بیانیے سے عبارت تھا۔ابتدائی عہد میں اس کی داستانوی، رومانی اور اصلاحی صورتیں ملتی ہیں اور دبستانِ پریم چند ویلدرم کی صورت میں حقیقت ورومان کے دھارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ترقی پسند عہد کا اسلوب ان دونوں کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ترقی پسندوں کے نزدیک چونکہ بنیادی چیز فکر کی بلا روک وٹوک ترسیل تھی اس لیے وضاحتی انداز اختیار کیا گیا۔اس میں تصنع، بناوٹ، پیچیدگی اور رمزو ابہام نہیں بلکہ یہ ایک رواں دواں بیانیہ تھا۔جدید افسانہ نگاروں نے روایتی بیانیہ اسلوب کی بجائے علامتی واستعاراتی انداز اختیار کیا۔عدم تکمیلیت، ابہام، اشاریت، رمزوایما، تجریدیت اور شعریت اس اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں۔تحریر کے ٹھوس پن کی بجائے سیال کیفیت زیادہ اہم ہوگئی۔اسلوب میں دائرے، لکیریں، قوسین اور نقطے نمودار ہونے لگے۔جملوں کو توڑنا، فقروں کو نامکمل چھوڑنا اور وقفہ، سکتہ اور خط کا استعمال عام ہوا اور لفظوں کو ادلنا بدلنا، شاعرانہ تلازمے بنانا، تمثیل و پیکر تراشی کرنا اور تشبیہات واستعارات لانا ضروری قرار پایا۔شفیق انجم لکھتے ہیں:

> جدید افسانے میں علامتوں کا استعمال تین طریقوں سے ظہور پذیر ہوا۔اول آسمانی صحائف، اساطیر، لوک کہانیاں، حکایتوں اور قدیم داستانوں کے بعض کرداروں کو ہم عصر ماحول میں زندگی دی گئی یا ان کے بعض واقعات کو اپنے زمانے سے ریلیٹ کیا گیا۔دوم فطرت اور مظاہر فطرت میں سے بعض اشیاء اور چرند پرند کو علامتی پیکر عطا ہوئے اور سوم

موجودعہد کی بعض ایجادات اور روزمرہ استعمال ہونے والی چیزوں کو بطور علامت پیش کرنے کا حوالہ سامنے آیا۔(۱۰۴)

شعور کی رو، آزاد تلازمہء خیال اور داخلی خود کلامی جیسی تکنیکوں سے استفادہ کیا گیا اور مجرد اشیاء و اجسام اور احساسات وکیفیات کو کہانی کا حصہ بنا کر پیش کرنے کی سعی کی گئی ۔ نئے افسانہ نگاروں نے چونکہ کہانی کے بنیادی واقعہ کے بجائے خیال پر زور دیا اس لیے زیادہ تر شعری انداز اختیار کیا گیا ۔ اختصار اور رمزو ایما کو اہمیت دی گئی ۔شعری عناصر کی موجودگی میں افسانے کی فضا نثری نظم سے قریب تر ہوگئی اور لطافت و شیرینی کا جو رویہ شاعری کے ساتھ مخصوص تھا افسانے میں بھی پیدا ہوگیا۔

جدیدیت کے سلسلے میں مہدی جعفر یوں رقم طراز ہیں:

> جدیدیت کی تحریک ترقی پسند مقصدی ادب سے انحراف اور نئی تبدیلیوں کی ضرورت تھی مقصدی ادب میں پروپیگنڈا، نعرہ بازی ،سیاسی تبلیغ ،رومانیت، جذباتیت، یا یک سطحی حقیقت نگاری داخل ہوگئی تھی، یہ ادبی جمود تھا جس کے ردعمل کا انداز جدیدیت میں شامل تھا پھر کچھ ہی دنوں میں جدیدیت سے منکر ادیبوں نے آواز اٹھائی کہ کہانی مر چکی ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔جدیدیت کی تحریک جیمس جوائس ،کافکا، کامیو، سارتر، راب گرے اور دوسرے مغربی فن کاروں سے متاثر تھی۔کردار نگاری پر کم توجہ کرنے ،کرداروں کو منہا کرنے ،زمان و مکان کی الٹ پلٹ، پلاٹ سے گریز، بیانیہ کی توڑ پھوڑ کرنے کی کوشش ہوئیں، نئی ہیئتی تشکیلات پر قائم افسانے لکھے گئے۔ نئے اسالیب تراشے گئے یا قدیم اسالیب کی بازیافت کی گئی۔جدید فن اپنا قاری (Narrate) متشکل چاہتا تھا۔(۱۰۵)

کلاسیکی افسانے کی تعریف میں کہانی کے مرکزی خیال اور زندگی کے بارے میں مصنف کے نقطہ نظر کا جو حوالہ ہے، جدیدیت نے اس کی شکل بھی تبدیل کردی ۔جدید افسانے میں موضوع پر ہیئت کی ترجیح اور اسلوبیاتی و تکنیکی تبدیلی کے نتیجے میں یہ صورت حال یکسر بدل گئی ۔مرکزی خیال کے ساتھ خیالات کی بھرمار میں الجھ کے رہ گئے اور زندگی کے بارے میں مصنف کا نقطہ نظر علامت و تجرید کی دھند میں کھو گیا۔ یہاں چونکہ اجتماعی سطح پر زندگی کے بارے میں کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا اور نہ ہی کسی نظریے یا عقیدے کی ترویج کے لیے ادب تخلیق کرنا مقصود تھا اس لیے افسانوں میں مرکزی خیال ان معنوں میں بھی ابھرتا دکھائی نہیں دیتا جو ترقی پسندوں یا رومانیوں کے ہاں معیار بنا

.....................................

۱۰۴۔ شفیق انجم، اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، اسلام آباد، یورپ اکادمی، ۲۰۰۸ء ص ۲۴۹۔

۱۰۵۔ مہدی جعفر، ''بیسویں صدی کا اردو فکشن: افسانہ''، مشمولہ، سہ ماہی پہچان الہ آباد، شمارہ ۵ ،ص ۲۷

رہا۔جدید افسانہ نگاروں نے زندگی کو کسی مخصوص زاویے سے دیکھنے کے بجائے مختلف زاویوں سے دیکھنے اور اس کی تعبیر کرنے کی سعی کی ۔اجتماع کے بجائے فرد کو زیادہ فوکس کیا گیا اور خارج میں زندگی کے موجود تسلسل کی بجائے داخلی دنیاؤں کو اہمیت دی۔ان افسانوں میں زندگی کا کوئی ایک رُخ ،زاویہ یا تصور نہیں بلکہ متنوع تصورات گھل مل کر سامنے آنے لگے اور چونکہ ان کا اظہار علامتی سطح پر ہوا اس لیے کسی ایک نقطے میں ان کے پھیلاؤ کو سمیٹنا ممکن نہ تھا۔

جدیدیت کا رجحان اگر چہ ساختیاتی تبدیلیوں سے متعلق تھا لیکن ترقی پسندوں کی مخالفت میں اس نے خارجیت اور اجتماعیت کی بھی نفی کی اور افسانے میں داخلیت اور شخصی حوالوں کو زیادہ اہم سمجھا۔اس حوالے سے تصوف سے بھی استفادہ کیا گیا لیکن زیادہ تر وجودی نظریات رہنما بنے۔نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ فکری طور پر انسان کی بے بسی اور زندگی کی بے معنویت کا نوحہ بن کے رہ گیا۔زندگی کی مثبت قدروں اور انقلابی رویوں کی طرف توجہ کم رہی اور سماجی زندگی کے خارجی حوالے بھی افسانوی افق سے رفتہ رفتہ غائب ہو گئے۔۱۹۶۰ءاور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یہ صورتحال زیادہ شدت اختیار کیے ہوئے تھی ۔تاہم ۱۹۸۰ء کی دہائی و مابعد اس روش میں تبدیلی آئی اور اعتدال و توازن کے ساتھ افسانے میں جدید رویوں کی پیش کاری کو فروغ ملا۔۱۹۸۰ کے عہد کو مابعد جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔مابعد جدیدیت ایک وسیع فلسفہ اصطلاح ہے۔مابعد جدیدیت کا تعارف کراتے ہوئے گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

> مابعد جدیدیت نظریہ نہیں ،نظریوں کا رد ہے۔دوسرے لفظوں میں آزاد تخلیقات جس پر نئی پیڑھی زور دیتی ہے اس کا دوسا نام مابعد جدیدت ہے۔اس اعتبار سے مابعد جدیدیت کی راہ ترقی پسندی ارو جدیدیت دونوں سے الگ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی سکہ بند نظریے کو نہیں مانتی لیکن آزادانہ آئیڈیولوجی کے تخلیقی تفاعل کی منکر بھی نہیں۔ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کے (یعنی مابعد جدید) ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس میں سماجی سروکار اکہرا اور سطحی نہیں ہے کیوں کہ وہ کسی پارٹی مینی فیسٹو کا محتاج نہیں بلکہ فنکار کی تخلیقی بصیرت کا پروردہ ہے۔(۱۰۶)

مابعد جدید اردو افسانہ نگاروں نے جدید اردو افسانہ نگاروں کے انتہا پسندانہ رویوں سے گریز کرتے ہوئے افسانہ میں پلاٹ ،کردار ،نقطہ عروج ،اور کہانی پن پر زور دیا۔مابعد جدید اردو افسانہ نگاروں نے کسی رجحان یا تحریک کا دباؤ قبول کیے بغیر آزادانہ روش اختیار کی۔مابعد جدید افسانہ نگاروں نے افسانویت اور بیانیہ پر زور دیا۔اور ایسا پیرایہ اظہار اختیار کیا جس میں فنی ہنرمندی اور ترسیل دونوں کا خیال رکھا گیا۔مابعد جدید اردو افسانہ سے قبل ترقی پسند افسانہ میں

..............................

۱۰۶۔ گوپی چند نارنگ،جدیدیت کے بعد،دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۵،ص۹۱۔

سپاٹ بیانیہ تشکیل دیا گیا تھا۔ جب کی جدید اردو افسانہ میں مبہم ،علامتی بیانیہ خلق کیا گیا۔اس کے برعکس مابعد جدید اردو افسانہ میں تہ دار بیانیہ تشکیل دیا گیا۔ مابعد جدید اردو افسانہ نگاروں نے اپنی بات کہنے کے لیے داستانوی انداز ،علامتی، تمثیلی ،استعاراتی طرز اظہار سے بھی کام لیا اور سادہ بیانیہ کو بھی اپنایا۔ مابعد جدید افسانہ نگاروں نے افسانہ میں نئے انداز سے کردار نگاری کی۔ کرداروں کو ان کے چہرے واپس کیے۔ کرداروں سے اکہراپن دور ہوا۔ مابعد جدید افسانہ نگاروں نے افسانہ میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے افسانوں میں اس لیے استعمال کیا تاکہ کہانی کے مرکزی خیال یا کہانی کے کسی کردار کی نفسیات پر روشنی پڑ سکے۔ منظر نگاری کے نام پر غیر ضروری تفصیلات سے پرہیز کیا گیا۔ مابعد جدید افسانہ میں نئ نئ تکنیک کا استعمال بھی کیا گیا۔ بیانیہ تکنیک کی بنیاد بصری پیکر پر رکھی۔اس فلمی تکنیک کو استعمال کرنے کی وجہ افسانہ میں دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ مابعد جدید افسانہ میں ہونے والی تکنیکی تبدیلیوں کے سلسلے میں سید محمد اشرف رقم طراز ہیں:

> ۱۹۸۰ء کی دہائی جدید تیکنالوجی کو برصغیر میں عروج پاتا دیکھتی ہے۔ یہ تیکنالوجی خلائی سرگرمیوں سے لے کر میڈیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ عام انسانوں کی زندگی سے ٹیلی ویژن قریب ہوا اور افسانہ نگاری نے اپنی کہانیوں میں ویڈیو تکنیک کی نیرنگیاں دکھائیں۔ فوٹو گرافی تکنیک، فلیش بیک کے نئے انداز، بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک نئے سین کے ساتھ دوسری بات شروع کرنا، چہرے کے تاثرات کو بعینہ کاغذ پر اتار دینا۔ خارجی زندگی کے مظاہر کی مدد سے داخلی زندگی کے معاملات کی ترجمانی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بیانیہ تکنیک کے یہ تمام عناصر ۱۹۷۰ء کے بعد کی کہانیوں کا طُرّۂ امتیاز ہیں۔(۱۰۷)

مختصر طور پر مابعد جدیدت کے افسانوں کی چند خصوصیت درجہ ذیل ہیں:

۔ ہر قسم کے نظریوں سے فنکار کا آزاد ہونا

۔کہانی پن ہونا لازمی/ بیانیہ/ واضح پلاٹ

۔دعوت غور وفکر

۔سماج اور زندگی سے متعلق ہر گوشے کو ادب کا حصہ بنانا

۔ بات کو دوٹوک انداز میں کہنا

۔بات کو فرد سے شروع کر کے اجتماع تک اور اجتماع سے سماج تک پہنچانا

.................................

۱۰۷۔ سید محمد اشرف،''اردو میں مابعد جدید افسانے کے تشکیلی عناصر کی شناخت۔ کچھ اشارے''مشمالہ،ادب کا بدلتا منظر نامہ،اردو مابعد جدیدت پر مکالمہ۔ مرتبہ، گوپی چند نارنگ، اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء،ص ۳۰۸

۔ تیز رفتار زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے

۔ دور حاضر میں عورت کے جو مسائل ہیں انہیں پیش کرنا

۔ بین الاقوامی مسائل میں دہشت گردی اور فرقہ پرستی

۔ بدلتے ہوئے رشتوں کی نوعیت

اردو افسانہ کے اس مختصر سے فنی جائزہ کے بعد حیدر قریشی کے افسانوں کا فنی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

## حیدر قریشی کی افسانہ نگاری: فن اور تکنیک

قدیم دور میں قصہ گوئی کا انداز یہ تھا کہ قصہ گو سامع یا قاری کو کسی کردار، صورت حال یا منظر کے بارے میں بڑے پُر یقین انداز میں حسب موقع بعض معلومات فراہم کرتا تھا۔ اور یہ یقین کیا جاتا ہے کہ قاری یا سامع ان باتوں کو درست مان لے۔ قصہ گو کو یہ اعتبار حاصل نہ ہو تو کہانی آگے چل ہی نہیں سکتی۔ ارود داستان گو کے اس اعتبار کی اپنی نوعیت تھی جس میں قاری کی سمجھ بوجھ پر کسی قسم کے شک کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا لیکن اردو قصے نے جب ناول اور مختصر افسانے کا روپ اختیار کیا تو مولوی نذیر احمد ہوں یا عبدالحلیم شرر اور پریم چند ہوں انہوں نے قصے کو اصلاح کا آلہ کار سمجھا اور قاری کو اپنا لازمی ہدف۔ ان کا خیال تھا کہ اگر قاری میں اتنی سمجھ ہوتی تو پھر وہ قابل اصلاح ہی کیوں ٹھہرتا، اس لئے ان کے ہاں اپنے موضوع اور کرداروں کے طول طویل وضاحتیں اور خطبے قاری سے مکمل تسلیم و رضا کا تقاضا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طویل فنی تبدیلی کے بعد یہ ہوا کہ پریم چند نے حقیقت زیست کی پیش کش (کفن، دودھ کی قیمت اور پوس کی رات میں) ایسی معروضیت کے ساتھ کی کہ مصنف کی ذات اور نظریہ پس پردہ چلے گئے اور اردو افسانہ نگاروں میں حقیقت کی پیش کش کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پریم چند کے بعد کی نسل کے اکثر افسانہ نگاروں نے ہندوستانی معاشرتی زندگی اور اس میں رہتے بستے انسانوں کو ان کے واقعاتی اور حقیقی روپ میں پیش کرنا اپنا مطمح نظر بنالیا۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کے بہترین افسانوں میں اپنے قاری پر اعتبار کی ایک نئی فضا تشکیل پاتی ہے۔ قدیم قصہ گوؤں کے پُر یقین بیانات کی بجائے حقائق زندگی کے ڈرامائی عکس اس اعتبار کے ساتھ پیش کئے جانے لگے کہ قاری از خود ان سے مطلوبہ مطالب اخذ کر لے۔ حیدر قریشی نے کسی نظریاتی گروہی وابستگی سے الگ رہ کر ایک آزاد فن کار بننے کی کوشش کی اور حقیقت کو بغیر کسی لگی لپٹی کے پیش کرنے کی کاوش

کی۔انہوں نے افسانے میں افسانویت کا بھی خیال رکھا۔وہ افسانے میں حقیقت کا واہمہ خلق کرنے کی بات بھی کرتے ہیں کیونکہ شدتِ واہمہ(intensity of illusion) کے بغیر افسانہ تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔

## حیدرقریشی کے افسانوں میں پلاٹ کی تعمیر

پلاٹ کا تعلق قصّے کے نظم ونسق سے ہوتا ہے۔اسے کہانی کی ریڑھ کہا گیا ہے۔پلاٹ کے بغیر افسانے کا تانا بانا تیار کرنا ممکن نہیں۔حقیقت پسند افسانے میں پلاٹ کو بہت بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔پلاٹ کا تصور ارسطو کے وقت سے تھا لیکن یہ صرف ڈرامے تک محدود تھا۔ارسطو نے پلاٹ کو المیہ کی وحدت و وسعت کا ضامن قرار دیتے ہوئے اس کو بنیادی حصوں (ابتدا، وسط اور خاتمہ) میں تقسیم کیا تھا۔جو باہم مربوط ہوتے ہیں۔دورِ جدید میں پلاٹ کی اہمیت کو شعور کی رو تکنیک نے ختم کر دیا۔آج کے ادیبوں نے پلاٹ کو روایتی قید سے آزادی دلائی۔نتیجتاً افسانے میں کردار کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی۔انہوں نے تخلیق فن میں ہمیشہ اس موقف کی پابندی کی۔حیدرقریشی نے اپنے افسانوں میں عام طور پر حقیقت پسند افسانے کی قائم کردہ روایت کی پابندی کی ہے۔ان کے افسانوں میں واقعات کا سلسلہ ایک مدھم پُر آہنگ سے آگے بڑھتا ہے اور ایک ایسے انجام تک پہنچتا ہے جو یکسر غیر متوقع نہیں ہوتا،اس میں علت ومعلول کے رشتوں کا خیال رکھا جاتا ہے ان کے افسانے دلچسپ اور اشاریت انداز میں شروع ہوتے ہیں۔ہر افسانے کی ابتدا شعر سے کی گئی ہے۔اس سلسلے میں قیصر تمکین لکھتے ہیں:

> ۔۔۔۔۔حیدرقریشی کی ہر کہانی کی ابتدا ایک شعر سے ہوتی ہے۔یہ طرز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہت مروّج تھا۔ایم اسلم تو اس کے ماہر تھے۔لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ ادبی نوادر خانوں میں بھی نسیاً منسیا ہوگیا۔حیدرقریشی نے اس طریقے کو نسیان خانوں سے نکال کر پھر استعمال کیا ہے۔لیکن ایک ندرت کے ساتھ۔۔۔دوسرے قلم کار''اقوال زریں'' کے طور پر اشعار یا کہاوتوں کو استعمال کرتے ہیں حیدرقریشی نے ہر نفس مضمون کی وضاحت کے لیے خود اپنے ہی اشعار پیش کیے ہیں۔اور یہ کہنا واقعی ناممکن ہے کہ انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔(۱۰۸)

حیدرقریشی کے افسانوں کا تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ ان کے افسانوں کے پلات پابندیوں سے آزاد ہیں۔ان کے افسانے سوچے سمجھے پلاٹ کے تحت نہیں ہوتے۔ان کے افسانوں میں پلاٹ اور واقعات پر زور دینے کے بجائے کردار کی ذہنی کیفیت پر زور دیا گیا ہے۔ان کے افسانوں کا مرکزی خیال انسان کے مسائل ہیں۔حیدر

..............................

۱۰۸۔ نذر خلیق،حیدرقریشی کی ادبی خدمات،راولپنڈی:میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء،ص۲۰۱۔

قریشی واقعات اور کردار کا مشاہدہ کر کے اپنے ذہن میں کہانی کی ابتدا سے اختتام تک کا خاکہ مرتب کرتے ہیں اس کے بعد افسانہ لکھتے ہیں۔ ۔افسانہ ''میں انتظار کرتا ہوں'' ( مجموعہ : روشنی کی بشارت ) افسانہ کے ابتدائی حصے پر نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ میں سوتیلے جذبوں کے عذاب سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور ممتا کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کر رہے ہیں
جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بن باس کے دن گزار رہا ہوں۔
میری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔
میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا
مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ (میں انتظار کرتا ہوں)

۲۔ مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں، زلیخا میرے تعاقب میں ہے
اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لیے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔
پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔
میری بے گناہی۔۔۔۔میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

(میں انتظار کرتا ہوں)

یہ چند نکات افسانے کے پہلے اور دوسرے صفحے سے اخذ کئے گئے ہیں۔اس کہانی میں تین کردار ( حضرت اسماعیل، حضرت یوسف اور بھگوان رام ) کو ایک کردار کا روپ دیا گیا ہے۔کہانی کا ''میں'' مذہب سے قطع نظر خالص ''انسان'' ہے۔ جو ہر دور میں ثقافتی سوالوں سے گھرا ہوا ہے۔اسی افسانے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

میں پھر سوچنے لگتا ہوں۔
میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔

ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔

میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں۔۔۔چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہوگئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''

**(میں انتظار کرتا ہوں)**

**حیدر قریشی کے دیگر افسانوں میں ابتدایئے اپنی اشاریت انگیز دلچسپی کے باعث بہت اہم ہیں مثلاً۔**

ا۔''تساں بادشاہ ہوا ساں کوں غریبی''

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریزہ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور اس مجہول سے فقیر نے جس انداز میں یہ مصرعہ گاتے ہوئے پڑھا ہے اس کا ایک لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ میری روح میں اتر گیا ہے۔

میں رُک گیا ہوں اور حیرت سے اس مجہول فقیر کو دیکھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک سرخ نوٹ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں میں پھنسا دیتا ہوں۔۔۔

ماہ رُخ نے میری اس سخاوت کو حیرت سے دیکھا ہے لیکن بولی کچھ نہیں۔

اس کے قرب سے مجھے لگتا ہے میں سچ مچ کا بادشاہ ہوں۔ **(غریب بادشاہ)**

۲۔ بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔

پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کہانی سنائی جائے۔

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خواپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔

لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:

''میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔ **(گلاب شہزادے کی کہانی)**

۳۔ اس دن ماں نے مجھے معمول کے مطابق فجر کے وقت جگایا تھا مگر اس کا لہجہ معمول کے مطابق نہ تھا۔
میں نے تاروں کی روشنی میں ماں کی آنکھوں میں تشویش جھلکتی دیکھی۔
ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سرخی پھیلی ہوئی تھی۔
لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کے بجائے خون پھوٹ بہا ہے۔ (آپ بیتی)

۴۔ بڑی عجیب اذیّت ہے۔
میں نماز پڑھتا ہوں، رکوع تک تو نماز ٹھیک رہتی ہے لیکن سجدے میں کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔
اسٹین گن اٹھائے، مکروہ تیکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ایک شخص میرے روبرو آجاتا ہے۔
میں سجدے میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ کہتا ہے:
''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' (ایک کافر کہانی)

۵۔ اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ، مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔
کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔
کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔
کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔

(روشنی کی بشارت)

۶۔اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چندھیا کے رہ گئی ہیں۔
ہر طرف روشنی کا سیلاب پھیلا ہوا ہے۔
دیواروں پر بڑے بڑے آئینے نصب ہیں جو روشنی کے سیلاب کی شدت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔
میں نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔
جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی بالکل ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟

(اندھی روشنی)

۷۔ یہ کہانی اس عجیب وغریب لمحے سے شروع ہوتی ہے جب تقدیر کے بارے میں میرے شکوک، یقین کی حد تک پختہ ہو چلے تھے۔
اسی لمحے میں تقدیر کو ایک ڈھونگ سمجھ کر اسے سرمایہ داروں کا استحصالی ہتھکنڈہ قرار دینے ہی والا تھا کہ
کسی نامعلوم قوت نے اس لمحے کو منجمد کر دیا اور میں شک اور ایمان کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

**(بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے)**

۸۔ ''ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیش نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔''

**(کاکروچ)**

۹۔ میں وہ اوڈیس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں اس لیے مجھے اپنے کردار کے علاوہ ہومر کا کام بھی خود کرنا ہے۔

**(۲۷۵۰ سال بعد)**

۱۰۔ آج میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ آج تو مجھے اپنی ایک اُلجھن کے بارے میں بتانا ہے۔

**(اعتراف)**

۱۱۔ ایک بہت بڑے فریم میں ابا جی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائنگ روم میں آویزاں کر رکھا ہے۔
گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی سجی ہوئی ہیں۔
گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔

**(مسکراہٹ کا عکس)**

۱۲۔ یہ ایسے کہانی کار کا قصہ ہے
جس کے سامنے کہانیاں بار بار آتی ہیں کہ وہ انہیں اپنا تخلیقی لمس عطا کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کرے لیکن کہانی کار ان کہانیوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔
اتنی ساری کہانیاں جو اس کا ایک نیا افسانوی مجموعہ تیار کر دیں۔
یہ کہانی کار صحافیانہ طرز کے افسانے اور ناول لکھنے والا ہوتا تو اب تک ایسی ہر کہانی کی دو دو تین تین کہانیاں بنا کر دو تین مجموعے چھپوا چکا ہوتا۔ دراصل کہانی کار کی جان ایک کہانی میں اٹکی ہوئی تھے اور وہ کہانی پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

**(کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار)**

اس طرح حیدر قریشی کے دیگر افسانوں کے ابتدائی سطور دیکھتے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ افسانے کی ابتدا ہی میں قاری کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لینے کا ہنر ہی نہیں جانتے بلکہ وہ اشاریت پیدا کر دیتے ہیں جس سے پوری کہانی کی فضا اور مستقبل کے امکانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

درحقیقت پلاٹ کا حسن اور اس کا معیار افسانہ کے اختتام پر ہوتا ہے۔ افسانے کی ابتدا کے بعد واقعات سہج سہج آگے بڑھتے ہیں اور ایک ایسے انجام تک پہنچتے ہیں جو پوری کہانی کا جواز فراہم کرتا ہے لیکن یہ کوئی حتمی جواز بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی قاری کے ذہن کو پوری تسلی ہوتی ہے۔ حیدر قریشی عموماً اپنے افسانے کو ایسے مقام پر لا کر ختم کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگتے ہیں۔ افسانے کا سفر صفحہ قرطاس پر ختم ہو جاتا ہے لیکن قاری کے ذہن کے اندر ایک نئے سفر کی شروعات ہوتی ہے ایسا سفر جو معنی خیزی کے ایک دلچسپ کھیل پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے چند افسانوں کے اختتامی جملے دیکھیئے۔

۱۔ اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔ سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔
پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر اور ۔۔۔۔ لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے تیر رہے تھے۔
اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔
گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔
گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔
گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔
مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا! **(گلاب شہزادے کی کہانی)**

۲۔ لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔
صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔
تیز۔۔تیز۔۔تیز
روشنیاں موسیقی اور رقص
بے زمین لوگوں کا اپنی لاشوں پر رقص۔ **(اندھی روشنی)**

۳۔ تب ہی وہ منجمد لمحہ پگھل گیا جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔ **(بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے)**

۴۔ ''دوستو!
ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں''۔

نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔ **(کاکروچ)**

۵۔ تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں اور کوئی مذہب نہیں۔
وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ایک عورت ہے۔
یہی اس کا نام ہے۔
یہی اس کا مذہب ہے۔ **(شناخت)**

حیدر قریشی کے ان چند افسانوں کے اختتامی جملے افسانے کے متن کو سر بہ مہر نہیں کرتے بلکہ پورے متن کے تناظر میں نئے معنوی امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں زندگی اور سماج کے کتنے ہی امکانات ہیں جو سوالیہ نشان بن کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ان کے دیگر افسانے (میں انتظار کرتا ہوں،اندھی روشنی،حوا کی تلاش، اپنی تجرید کے کشف کا عذاب،کاکروچ،شناخت،دھند کا سفر) ironic اور praradoxical صورت حال کے جنم پر ختم ہوتے ہیں۔ افسانے کی فضا ایک بھر پور بازگشت کے ساتھ ماہیت قلب کر دیتے ہیں اور پوری کہانی قاری کے ذہن میں ایک نیا سفر شروع کر دیتی ہے۔کامران کاظمی رقم طراز ہیں۔

> حیدر قریشی بلاشبہ اپنے عہد کا نباض افسانہ نگار ہے۔جو تلخ سماجی حقیقتوں کے گھونٹ پیتا ہے اور پھر اپنے قاری کو کہانی سنانے بیٹھ جاتا ہے تو اس کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیتا ہے جن سے قاری بے خبر ہوتا ہے۔حیدر قریشی کا کہانی کہنے کا انداز تیکھا مگر دلنشیں ہے وہ قاری کو حیرتوں میں گم کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی اسے نئی دنیاؤں کے راستے بھی سجھاتے ہیں۔(۱۰۹)

حیدر قریشی کے افسانوں کے پلاٹ کی چند خصوصیت درج ذیل ہیں:

۱۔ آغاز مختصر مگر جامع ہوتا ہے اور آغاز میں چونکا دینے والا عنصر نظر آتا ہے۔

۲۔ درمیان میں جزئیات نگاری، کردار نگاری یا منظر نگاری کے ذریعے حقیقت نگاری کی جاتی ہے اور اسی سے افسانے میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔

..........................................

۱۰۹۔ ''حیدر قریشی کے افسانوں کا ایک مطالعہ''،مشمولہ،عکاس اسلام آباد،شمارہ:۵ مارچ ۲۰۰۷،ص ۳۸

۳۔ حیدر قریشی کے افسانوں کے درمیان میں ضمنی کہانی جیسے بیانات بھی آتے ہیں مگر یہ اختتام کو موثر بنانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

۴۔ اختتام میں ایک موڑ نظر آتا ہے مگر اس موڑ کے لئے کہانی کے درمیان میں جزئیات نگاری کی مدد سے کئی واقعات مسلسل پیش کئے جاتے ہیں اور اس سلسلہ واقعات کا آخری حصہ آخری موڑ کی طرف لانے میں مدد کرتا ہے ۔درمیان میں مختلف واقعات مسلسل نظر آنے کی وجہ سے قاری کو اختتام کا منظر منطقی مگر موثر نظر آتا ہے۔

۵۔ آغاز اور اختتام بھی مختصر مگر جامع ہوتا ہے ۔آغاز اور اختتام مختصر ہونے کے باوجود درمیان میں واقعات تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اور ان کا بہاؤ منطقی طور پر ہوتا ہے۔

۶۔ درمیان کے واقعات بعض دفعہ افسانے کے بنیادی قصے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔یوں جیسے ایک قصے میں کئی قصے شامل کر دیے گئے ہوں۔مگر اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی کا سرا آغاز سے جا ملتا ہے۔دراصل یہ سارے واقعات اختتام کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔اس صورت میں پلاٹ کا غیر منظّم کہنا بے جا نہ ہوگا۔(غریب بادشاہ)

۷۔ افسانے کا مقصد پوری طرح سے افسانہ نگار کی گرفت میں ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ حیدر قریشی کے افسانے بغیر کسی ہچکولے اور شور شرابے کے اپنے سفر کے بظاہر آخری مرحلے پر پہنچتے ہیں لیکن ان کے متن کی قرات کے مسافر (قاری) کو کبھی بھی یہ مرحلہ آخر نہیں لگتا بلکہ یہاں پہنچ کر اس کے سامنے نئے سفر کے کئی امکانات کھل جاتے ہیں۔

## حیدر قریشی کے افسانوی کردار:

حیدر قریشی کے افسانے میں انسانی سماج میں رہتے بستے انسانوں کی انفرادیت اور معاشرتی زندگی کے نقش اس انداز میں ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے یا اس کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قاری زندگی اور افسانے کا فرق بھول جائے۔سماج میں نہ سب انسان ایک ہی انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں اور نہ ان کی شخصیتیں بہت سے اشتراکات کے باوجود ایک جیسی ہوتی ہیں۔نہ ایک ہی شخص کی شخصیت زندگی کے تسلسل کے سفر میں غیر مبدل (خارجی اور باطنی دونوں سطحوں پر) رہ سکتی ہے۔زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فرد کی زندگی ایک رُخی نہیں ہوتی ،نہ کوئی فرد مجسمہ شر ہو سکتا ہے نہ کوئی مکمل خیر کی تجسیم بن سکتا ہے۔نہ وہ مجسم صدق وصفا رہ سکتا ہے نہ جھوٹ اور فریب کا مجموعہ۔نہ

وہ زندگی کے ہر مرحلے اور ہر لمحے میں خوف و خطا سے پاک ہوسکتا ہے۔حیدرقریشی نے اپنی افسانوی دنیا میں انسانی زندگی سے مماثل دنیا اور عام انسانوں جیسے کردار تخلیق کرتے ہوئے اپنے اس مشاہدے اور تجربے کو پیش نظر رکھا ہے ،وہ ایک زندہ انسانی سماج میں انسان کے عام و خاص سماجی رویوں اور ماحول کے تناظر میں اپنے افسانوی کرداروں کو گوشت پوشت کے زندہ انسانوں کی مانند چاہتے ہیں۔اس لئے وہ اپنی تخلیق کردہ افسانوی دنیا میں انسان کے ہمہ خارجی اور باطنی تضادات کو تحلیل نہیں ہونے دیتے بلکہ باقی رکھتے ہے۔

حیدرقریشی کے افسانوی کرداروں کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں ہر ایک اپنے پس منظر اور ذاتی تاریخ کے حوالے سے کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہ خود ہی ہیں لیکن اِس کی شناخت کردار کے دوسروں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر قائم ہوتی ہے۔بظاہر ایک دوسرے سے مماثل اور ساتھ ہی ساتھ منفرد لوگوں کا انبوہ مل کر سماج کی تشکیل کرتا ہے اس لئے فن اور زندگی میں حقیقت پسندانہ اندازِ فکر انہی عام لوگوں کی زندگی کو اصل حقیقت قرار دیتا ہے۔حیدرقریشی کے افسانوی کردار کی نیکی و بدی منٹو،عصمت ،قاسمی اور دیگر افسانہ نگاروں کی طرح افسانے میں کوئی شعلہ نہیں بھڑکاتے بلکہ چنگاری اڑاتے ہیں۔حیدرقریشی نے افسانے میں معاشرے کو ایک کردار بنا کر پیش کیا ہے جس کے ساتھ دوسرے کردار جدو جہد کرتے ہیں۔حیدرقریشی کے افسانوں میں مرکزی یا اہم کردار کے لئے ''میں'' کا صیغہ استعمال کیا ہے۔انہوں نے اپنے کرداروں کو نام نہیں دیا شاید اس لیے کہ ان کرداروں کو نام نہ دے کر ایک ایسا ابہام پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے قاری کے لئے ان کے کرداروں ساتھ خود کو مشخص کرنے اور اسی طرح ان کی معنی خیزی کے امکانات میں اضافہ ہو سکے۔

ہر دور اور تحریک خود میں مکمل بھی ہے اور نامکمل بھی۔ ماضی ہمیشہ اچھے اور بُرے دونوں قسم کے اثرات مرتب کرتا ہے۔جس طرح کہانی کہیں نہیں گئی ٹھیک اسی طرح کردار بھی کہیں نہیں گئے۔بس انہیں محسوس کرنے کی دیر ہے۔آج کا کہانی کار پریم چند کے دور کی کہانیاں کیوں کر لکھے گا۔کیوں وہ کوئی داستانوی کردار تخلیق کرے گا،جب کہ اس کے آس پاس ہم اور آپ جیسے مختلف کردار موجود ہیں۔جب ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کہانی کار اپنے معاشرے سے متاثر ہو کر لکھتا ہے تو ہم آج کے ایلیکٹرانک دور میں خوابوں خیالوں کی باتیں نہیں کر سکتے۔اسی لیے آج کے افسانوں میں ہمیں کردار بے نام ملتے ہیں۔افسانے کا ''میں'' کسی نام کا محتاج نہیں کیونکہ اس ''میں'' میں بہت

سارے لاتعداد نام چھپے ہوئے ہیں۔آج کے بے نام افسانوی کردار (میں ) سے قاری خود کو جوڑ کر دیکھتا ہے۔جس وجہ سے کردار میں خود بخود ایک کشش سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ایسا کرنے پہ قاری اور کردار (میں ) کے درمیان تمام فاصلے ختم ہو جاتے ہیں اور قاری افسانے میں اپنی ذات کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔حیدر قریشی کے افسانوی کرداروں (میں ) کے ساتھ بھی قاری اپنی شناخت قائم کرنے کی ترغیب محسوس کرتا ہے۔قاری اپنے اندر نئے امکانات کو منکشف ہوتے دیکھتا ہے۔حیدر قریشی کے کردار مقدر اور زندگی کے ساتھ رواداری کے سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں،زندگی جو ہمہ قسم امکانات سے بھری ہوئی ہے۔چند مثالیں پیش نظر ہیں:

۱۔ میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔

میں آل ابراہیم سے ہوں۔ (میں انتظار کرتا ہوں)

اس ''میں'' کی جگہ اگر قاری خود کو رکھ کر دیکھے تو اس کی سچائی بھی یہی ہے کہ وہ آل ابراہیم سے ہے۔

۲۔ تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

(گلاب شہزادے کی کہانی)

افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' کا ''میں'' ہمیں موجودہ ازدواجی زندگی کی کہانی سناتا ہے۔

۳۔ ''رات دو بجے۔۔۔عقبی دروازہ۔۔۔ٹھیک!''

میں اس بے ربط مگر معنی خیز تحریر کو پڑھتا ہوں اور اس خوبصورت لڑکی کا سراپا مجھے اپنے پورے وجود میں خوشبو بکھیرتا محسوس ہوتا ہے جو ایک عرصے سے میرے دل ودماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے مجھے کئی دفعہ اس خوبصورت لڑکی سے لاتعلقی کی نصیحت کی تھی۔

مگر میں نے ہمیشہ اس کی نصیحت کو نظرانداز کیا۔

اور آج جب اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔

(آپ بیتی)

افسانہ ''آپ بیتی'' کے ''میں'' سے ہر وہ انسان خود کو جوڑ کر دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنی

نفسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دنیا کی نصیحتوں کو رد کیا ہو۔

۴۔ سب سے آخر میں امی نے مجھے بلایا ہے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو میں ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھتی ہوں۔

راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں!

میں ''امی جی'' کہہ کر ان سے لپٹ جاتی ہوں۔

مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔

شاید یہ ممتا کی حرارت ہے! **(ممتا)**

ماں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شے نہیں اور ماں کے لمس کا احساس سب سے بالاتر ہے۔ یہ بات ہم سبھی کے لیے universal truth ہے۔ یہاں بھی کردار (میں) اور قاری کو افسانہ نگار نے جوڑے رکھا ہے۔

۵۔ میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو ابا جی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔

میں سب سے بچ بچا کر اور چُھپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو ابا جی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

**(مسکراہٹ جا عکس)**

حیدر قریشی کے افسانوی کرداروں کا ایک معروف اور اہم وصف ان میں سماجی اقدار کی تجسیم بھی ہے۔ وہ قاری کی دلچسپیوں اور سماجی و اخلاقی قدروں کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور وہ اپنے کرداروں کو خود اپنے قارئین جیسا دکھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کے مقصد میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائیں۔ افسانہ نگار جس سماج کا حصہ ہے اس کی مستحکم اقدار ان کے افسانوی کرداروں کے توسط سے اظہار پانے لگتے ہیں۔ حیدر قریشی کے کچھ افسانوں کے کردار سمجھوتہ بازی کے راستوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ حیدر قریشی اس طرح ایک سماج کے اندر رہنے والے انسانوں کی عملی زندگی کے امکانات کو منکشف کرتے ہیں۔

۱۔ کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔۔۔ میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔

ابا جی کی آنکھوں کی اداسی جیسے بولنے لگتی ہے: اس نے تمہیں دُکھ پہنچایا، برا کیا۔ تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔ کیا مل گیا بدلہ لے کر؟

کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

**(مسکراہٹ کا عکس)**

۳۔ گاڑی چلتی ہے۔۔۔۔
ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔
گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئر مین تک پہنچ چکی ہیں۔
پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔جتنے منہ اتنی باتیں۔
بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک ''یک چشم'' داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔
میں سناٹے میں آ گیا ہوں۔اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔۔۔۔۔
پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔
اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جاتا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں۔

**(دھند کا سفر)**

۴۔ قتل،اغوا،ایکسیڈنٹ اور آبروریزی کے واقعات اب بھی ہوتے ہیں مگر لوگ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔
انہوں نے آسمان کی سرخی کو بھی معمولات زندگی میں شمار کر لیا ہے۔

**(آپ بیتی)**

۵۔ مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ڈال دیتا ہے،اور عورت۔۔۔وہ اپنی سادگی کے باعث ہر ناکردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے۔آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے۔۔۔۔''

**(ممتا)**

۶۔ یہ روشنیاں اب مجھے راس آ گئی ہیں اور میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔
اب میں اس کے اشاروں پر نہیں ناچ رہا بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچا رہا ہوں۔۔۔لیکن یہ کیا؟
سامنے دیوار پر نصب آئینے میں میرے اندر کے ''میں'' کی بے کفن لاش مجھے گھور رہی ہے۔
میں گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔لیکن ادھر بھی بڑا آئینہ نصب ہے اور اس میں بھی وہی منظر ہے میرے چاروں طرف میری لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں:
''کاش میرا وہ اندھا پن ہی لوٹ آئے''

**(اندھی روشنی)**

۷۔ میں اس کا مفہوم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں اور معنویت کے سرے بے معنویت سے ملاتا ہوں۔

تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔۔ یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔۔
ہم سب کی ہے۔ **(اپنی تجرید کے کشف کا عذاب)**

یہاں سماجی اور اخلاقی معیارات ان کرداروں کو زندگی سے ایک نئی مفاہمت اختیار کرنے سے نہیں روکتے۔ حیدر قریشی کی اپنے کرداروں کے ساتھ وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کرداروں کو اپنے وجود کا حصہ بنا کر پیش کیا۔ خیر وشر کے بارے میں تمام فلسفوں، عقیدوں اور نظریوں کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ انسانی اعمال، افکار، تصورات اور ارادوں کو خیر اور شر کے الگ الگ زمروں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں، جو خیر ہے وہ شر نہیں ہو سکتا اور جو شر ہے وہ خیر نہیں بن سکتا۔ یہ بظاہر مذہبی عقیدہ سہی لیکن جدید وقدیم سب فلسفے بالآخر یہیں پہنچتے ہیں اور آزاد خیال، وجودیت بھی اس تعریف سے بالا تر نہیں۔ حیدر قریشی کے فلسفۂ زیست کے اخذ وقبول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ لیکن جن کیڑوں کو تم نے نہیں مسلا وہ بھی مردہ ہیں۔ یہ سارے کیڑے مردہ ہیں۔
صرف پنکھے کی ہوا سے زندہ معلوم پڑتے ہیں۔
یہ بھی جادو کے کھیل ہیں۔
قسمت کے کھیل ہیں۔۔۔
ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟'' **( پتھر ہوتے وجود کا دکھ )**

۲۔ مرد ساری زندگی عیاشی کرتا رہے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عورت سے زندگی میں ایک بار بھول ہو جائے تو اس کی ساری زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔'' **(انکل انیس)**

حیدر قریشی کے تمام افسانوی کردار اپنے گرد وپیش سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے بقول کامران کاظمی:

> حیدر قریشی کے ہاں دو طرح کے کردار اہم ہیں۔ صوفیانہ مسلک اختیار کیے ہوئے یا کرتے ہوئے کردار اور دوسرے ایسے نوجوان کردار جن میں زندگی اپنے نئے راز کھولتی اور کروٹیں بدلتی، جذبات بیدار کرتی ہوئی اور چہلیں لگاتی در آتی ہے۔ دراصل یہ کردار ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔ اور افسانہ نگار افسانے کی موضوعاتی ضرورت کے تحت ان کرداروں کو استعمال کرتا ہے۔ (۱۱۰)

..............................

۱۱۰۔ ''حیدر قریشی کے افسانوں کا ایک مطالعہ''، مشمولہ، عکاس اسلام آباد، شمارہ: ۵ مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۲۸۔۲۹۔

حیدر قریشی کے ہاں وجودیت کے فکری عناصر سے استفادے کی روایت بھی موجود ہے۔زندگی کے چھوٹے بڑے ڈر، قدم قدم پر فیصلے کی بے اختیاری کا خوف، تنہا رہ جانے اور جبر کے دائروں میں اسیر ہو جانے کا کرب، ذات کے ٹوٹنے، بکھرنے اور یقین و بے یقینی کی اذیت، یہ سب ان کی کہانیوں میں وجودی رویے ہیں۔ان کے کردار ایک پراسرار دہشت اور خوف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔پہچان کے گمشدہ ہو جانے اور زندگی کی بے معنویت کو انہوں نے عصری مفاہیم بھی دیکھا دکھایا اور خود اپنی ذات کے خلا میں بھی ان کی حیثیت مرتب کرنے کی سعی کی۔کامران کاظمی کے نزدیک:

حیدر قریشی کے افسانوں کے کردار ایک خوف کا شکار رہتے ہیں اور مکمل سچ جاننے کے باوجود اس کے اظہار میں سماجی جبر کے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس طرح ان کے نفسیاتی رجحان کا مطالعہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔لیکن یہ تمام کردار سچ کا اظہار نہ کر سکنے کے باعث زندگی سے گریز کا رویہ اپناتے ہیں۔اور مستقبل ان کے لیے دھند میں گم ہو جاتا ہے۔کہیں کہیں ایک ردعمل کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔اور یہ ردعمل اس نظام کی بساط ہی لپیٹ دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔مگر دھند لکے میں واضح نظر نہ آنے کے باعث ان کے کردار اس ردعمل کا اظہار اپنی ہی ذات کی نفی کر کے کرتے ہیں۔اور اپنی ذات کی نفی کا ایک اظہار وحدت الوجود میں بھی ہے۔اور یہ مثبت بات ہے کہ وہ اپنی نفی کرتے ہوئے جہان دیگر کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔(۱۱۱)

اس سلسلے میں افسانوں سے مثال ملاحظہ ہو۔

۱۔ میں خوف سے کانپ اُٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔
میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا'' خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔
مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی'' لیکن بلآخر میرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔

**(گلاب شہزادے کی کہانی)**

۲۔ میں پھر خوفزدہ ہو کر سڑک پر نکل آتا ہوں اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی سرخی دراصل میرے اس ہونے والے ریپ کی گواہ اور اس خوبصورت لڑکی کے بہنے والے خون کا ثبوت ہے۔
لیکن ہم دونوں میں اصل مجرم کون ہے؟ **(آپ بیتی)**

.....................................

۱۱۱۔ ''اردو افسانوں کا ایک مطالعہ''، مشمولہ، عکاس، اسلام آباد، شمارہ: ۵ مارچ ۲۰۰۷ء ص ۲۵۔

۳۔ میں سجدے میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں۔
وہ کہتا ہے: ''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا''۔۔۔۔۔
''تو کیا میں بھی حیض کی کیفیت میں ہوں؟''

**(ایک کافر کہانی)**

۴۔ میں نے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔
جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟

**(اندھی روشنی)**

۴۔ میرا مستقبل میرے داہنے ہاتھ پر اور میرا ماضی میرے بائیں ہاتھ پر ہمیشہ رقم رہتا تھا اور میں اپنے ماضی اور مستقبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ حال میں رواں رہتا تھا۔
مگر اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو مجھے وہاں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی نظر آئی۔
میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو وہاں دھواں دھواں فضاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

**(حوا کی تلاش)**

کہتے ہیں کہ انسان ساری دنیا کی آواز بند کر سکتا ہے لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چونکہ حیدر قریشی کے افسانوی کردار عام کردار ہیں، ہم اور آپ جیسے اسی معاشرے کا حصہ، اس لیے وہ معاشرے میں ہو رہی برائیوں سے خود کو دور نہیں رکھ پاتے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہونے والے واقعات سے کسی نہ کسی طور پر متاثر ہونا اور خود کو نفسی برائیوں سے دور رکھنے کی کشمکش ان کے افسانوی کرداروں میں بخوبی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔

۱۔ ''شیطان ہمارے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی۔

**(دو کہانیوں کی ایک کہانی)**

لیکن حیدر قریشی بالآخر اپنے افسانوی کرداروں ( میں ) کو ضمیر کی روشنی کے دائرے میں قید کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ اپنے اختتام پر پہنچتے پہنچتے قاری کے ذہن پر اثر قائم کرتا ہے۔ کچھ ایسے سوال جو ہم اور آپ کو اکثر پریشان کرتے ہیں، اسے حیدر قریشی نے اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعہ سے قائم کیا ہے۔ میرا خیال ہے افسانہ پڑھنے کے بعد کم از کم ایک بار قاری ان سوالوں پر غور ضرور کرے گا۔ کیونکہ ہم سب اپنے ضمیر کے پابند ہیں۔ مثال۔

۱۔ ''یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو''۔

**(غریب بادشاہ)**

۲۔ دنیا پر عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔اپنی ماں اور باپ کی اس تشویش کو دیکھ کر مجھے بھی کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے۔

**(آپ بیتی)**

۳۔ میرے لئے اب رات یا دن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ روشنی کا ہالہ اگر میرے ساتھ نہ ہو تو میرا دن بھی تاریک ہو جائے۔
روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے
''اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

**(حوا کی تلاش)**

۴۔''دین کو سمجھنے کے لیے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔تمام عوالمِ الٰہی کو سمجھ کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔''

**(روشن نقطہ)**

۵۔ ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقوں، سب کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔
جو مہارت کے ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ جائے وہ متقی، پرہیزگار اور مومن ہے۔

**(انکل انیس)**

بلاشبہ حیدر قریشی نے اپنے کرداروں کے توسط سے زندگی کے مسائل کی عقدہ کشائی کرنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔

## حیدر قریشی کے افسانوں میں نقطِ نظر:

جدید بیانیہ افسانوی ادب (narrative ficton) میں نقطِ نظر (point of view) ایک اہم تنقیدی اصطلاح ہے عموماً اسے مصنف کے اخلاقی، سماجی، سیاسی یا فکری رُوح کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے جس کا اظہار وہ کبھی براہ راست اپنی آواز میں، کبھی کرداروں کے ذریعے، کبھی واقعات اور ان کی فنی ترتیب (پلاٹ) کے ذریعے، افسانے یا کرداروں کے عمل کے انجام کے ذریعے اس طرح کرتا ہے کہ افسانے کے فنی تقاضے مجروح نہ ہوں۔ایک اعلیٰ فن کار کے مقصد، نظریات اور تصورات افسانے کے تانے بانے میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ انہیں الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔'' غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ نقطہ نظر کا ربط بھی پلاٹ ہی کی تشکیل سے مربوط

ہے مصنف کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ناول ( یا افسانے ) کے واقعات کو کس کردار کی آنکھوں سے دیکھے گا اور کس طرح اس کا ردِعمل واضح کرے گا۔'' (۱۱۲)

کسی بھی ادبی تخلیق میں فکر کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر فنکار اپنا ایک نظریہ حیات رکھتا ہے۔ اپنے چاروں طرف پھیلی اور بکھری چیزوں کو اپنے مخصوص نظریہ سے دیکھتا ہے۔ اور یہی عوامل اس کی فکر اور خیال کے محرک بنتے ہیں اور پھر فن کی شکل میں ڈھل کر اظہار کے عمل کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس لئے ہر فنکار کی تخلیق اس کے نظریہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن جدید تنقید نے افسانے میں نقطہ نظر کو صرف مصنف سے مخصوص کر دینے سے انکار کیا ہے کیونکہ افسانے ( زیادہ تر ناول میں ) نقطہ نظر کی تبدیلی کے متنوع مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تصوراتی طور پر افسانے میں لاتعداد نقطہ نظر ممکن ہیں۔ نقطہ نظر کو اگر راوی ( جو ضروری نہیں کہ مصنف خود ہو، وہ کہانی کا کوئی اہم یا معمولی کردار یا کہانی سے باہر کا کوئی شخص ہو سکتا ہے ) سے مخصوص کر دیا جائے تو کہانی کے اندر کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب راوی کی بجائے کسی اور کردار کا نقطہ نظر حاوی ہو جاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے ہم کئی طرح کے نقطہ ہائے نظر سے دوچار ہوتے ہیں۔ راوی کی دیگر اقسام سے افسانے کے طرزوں اور معنویت میں بھی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں نقطہ نظر کا فرق اتنا اہم ہے کہ شاہد کے بدل جانے سے مشاہدے کی کیفیات بدل جاتی ہیں۔ یہی نہیں کرداروں کے باہمی رشتے اور کہانی کے عمل کے دوران میں ان کے اندر آنے والی تبدیلیاں بھی نقطہ نظر کی تشکیل اور تبدیلی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں لیکن افسانے میں اس کی شناخت کیسے ہو؟ بات پھر وہیں مصنف پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ تاہم حیدر قریشی کے افسانوں میں نقطہ نظر (point of view) کی اس لئے بڑی اہمیت ہے کہ اس کے بیشتر افسانوں میں مصنف کی عدم موجودگی کے باعث نقطہ نظر کا تنوع دکھائی دیتا ہے۔ یہ تنوع ایک ہی افسانے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی فکر و نظریہ کی سطح پر اپنی الگ شناخت اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان کی فکر کسی خاص نظریہ یا مخصوص مکتبہ فکر کے تابع نہیں۔

بقول ڈاکٹر فہیم اعظمی:

> حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور

.........................................

۱۱۲۔ عابد، علی عابد، اصولِ انتقادادبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۵۰۳۔

اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلو بیر کے لفظوں میں SLICES OF LIFE کہا جا سکتا ہے مگر ان میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور روحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور ان کی اٹھان عمودی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیما پن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں میں زبان اور حوالہ جات اس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں ان کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن ان کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے کا قاری ان کہانیوں میں امکانی سچائی دیکھ سکتا ہے۔ (۱۱۳)

حیدر قریشی کے افسانوں کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ۔

۱۔ حیدر قریشی کے اکثر افسانوں میں کہانی ایک ایسے راوی کے نقطہ نظر سے جنم لیتی ہے جو خود افسانے کا حصہ نہیں ہے اور ایک حد تک راوی کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن وہ (شاید) کرداروں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کا کہیں بھی اظہار نہیں ہونے دیتے۔ ان کا ہنر یہ ہے کہ وہ حسب ضرورت انتخاب کر کے افسانے کو تعمیر کرتے چلے جاتے ہیں۔ (نیک بندوں کی بستی، بابا جمالی شاہ کا جلال، اعتراف، انکل انیس، شناخت، بھولے کی پریشانی)

۲۔ راوی خود کہانی کا ایک کردار ہے اور صیغہ واحد متکلم میں کہانی بیان کرتا ہے۔ (میں انتظار کرتا ہوں، ایک کافر کہانی، مسکراہٹ کا عکس، روشنی کی بشارت، بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے، کاکروچ، کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار،)

۳۔ راوی صیغہ واحد متکلم میں کہانی بیان کرتے ہوئے اور خود کہانی میں موجود ہوتے ہوئے بھی اصل کہانی کا حصہ نہیں ہے یا معمولی کردار ہے۔ (مامتا، بھید، گھٹن کا احساس، روشن نقطہ،)

۴۔ حیدر قریشی کا اصل ہنر یہ بھی ہے کہ اس کے افسانوں میں نقطہ نظر شروع سے لے کر آخر تک یکساں نہیں رہتا ہے۔ لیکن نقطہ نظر کی تبدیلی کا عمل افسانے میں اس مہارت سے ہوتا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ راوی

..............................................

۱۱۳۔ نذر خلیق، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء، ص، ۲۰۹۔

سے ایک کردار اور پھر کرداروں کے مابین افسانے کا واقعاتی اور معنوی تناظر کھسکتا اور بدلتا رہتا ہے۔ افسانہ (مسکراہٹ کا عکس، اپنے وقت سے تھوڑا پہلے، غریب بادشاہ، حوا کی تلاش، اندھی روشنی)

حیدر قریشی کے افسانوں کی فکری بلندی کو ہم ان کے افسانہ (میں انتظار کرتا ہوں، روشن نقطہ، روشنی کی بشارت، کاکروچ) وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ آج ایک انسان جو ظاہر میں فرشتہ نما معلوم ہوتا ہے لیکن اندر سے وہ اپنے نفس کا غلام ہے وہ کسی کا دوست اور ہمدرد نہیں ہوتا۔ خلوص نام کی کوئی چیز نہیں۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو وہ پیٹ کی بھوک اور جنسی خواہشات کا غلام ہے۔ حیدر قریشی کے کئی افسانے (میں انتظار کرتا ہوں، گلاب شہزادے کی کہانی، دُھند کا سفر، آپ بیتی، مامتا، اندھی روشنی، بھید، انکل انیس، اعتراف، ایک کافر کہانی) اس کا احساس دلاتے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی لکھتے ہیں۔

> گلاب شہزادے کی کہانی'' میں زندگی کی سچائیاں ہیں۔''شناخت'' حیوانیت اور درندگی سے معمور انسانوں کی شرمناک داستان ہے جس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔''روشنی کی بشارت'' اور''ایک کافر کہانی'' میں حیدر قریشی کے مذہبی افکار وعقاید کا پرتو نظر آتا ہے۔ اسی طرح ان کے دوسرے افسانے بھی ان کی فنی صلاحیتوں اور صحتمند تعمیری مقصدیت کی غمازی کرتے ہیں۔ سبھی افسانے نئے زاویۂ نگاہ، نئے لہجہ، اور اسلوب نگارش اور نئی فکر سے آراستہ ہیں۔ اس کے علاوہ جدیدیت کے شیدائیوں کو نئی سمتوں اور ان امکانات سے آشنا کرتے ہیں جن کے رشتے انسانیت کی بازیافت اور اس کی بہبود و بقا سے مستحکم ہیں۔ افسانوی ادب میں حیدر قریشی کے افسانے لایق قدر اضافہ ہیں۔ (۱۱۴)

## حیدر قریشی کے افسانوں میں فضا بندی:

افسانے میں فضا بندی (setting) اور ماحول (atmosphere) کی بڑی اہمیت ہے۔ فضا بندی کی اصطلاح فکشن کی تنقید میں ڈرامے سے آئی ہے۔ ڈرامے میں منظر اور ماحول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ فکشن کی بنیاد یں اگر چہ بیانیہ پر استوار ہوتی ہیں لیکن یہاں بھی منظر، ماحول اور مکالمہ معنی خیزی کے بنیادی حربے ہیں۔ فضا بندی افسانہ کو ماحول اور پس منظر مہیا کرتی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ کردار سے کچھ اعمال سرزد ہوتے ہیں اور افسانے کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں بلکہ ان اعمال اور واقعات کی معنویتیں بھی ابھرنے لگتی ہیں۔ فضا بندی افسانے کی تمثیلی، استعاراتی اور علامتی ساختیات کی تشکیل میں بھی بڑا بنیادی اور اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہر افسانہ ایک منفرد فنی

............................................

۱۱۴۔ نذر خلیق، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۳۔

وحدت رکھتا ہے اس لئے ہر افسانے میں فضا بندی اور ماحول سازی کے بھی الگ اور منفرد انداز سامنے آتے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ افسانہ نگار نے افسانے کے عمل، واقعات اور کرداروں کو محض ایک کمرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ پورے گھر، محلے اور پورے شہر پر محیط کیا۔ جس میں ایک انتہائی پیچیدہ معاشرتی ماحول، ایک بڑے صنعتی شہر کی ساری ہماہمی ساری افسردہ کن تنہائی اور بے حس ویرانی موجود ہے۔ اردو کے افسانہ نگار پریم چند، راشدالخیری، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں نے گھر، شہر اور دیہات کی مخصوص فضاؤں کو اپنے اپنے انداز و اسلوب اور اپنے اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق تعمیر و تشکیل کیا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں میں بھی فضا بندی کا وسیع تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضاؤں میں ایک جہان معنی انسانی زندگی کی آبادیوں میں آباد دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے جدید انسانی معاشرت کی فضا میں مسلسل معدوم ہونے والی ابتدائی معاشرتوں کی فضا اور ماحول کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ (مامتا، گلاب شہزادے کی کہانی، آپ بیتی، شناخت وغیرہ)

۲۔ افسانہ نگار خواب وخیال کی فضا سے بھی کام لیتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانہ (کاکروچ، حوا کی تلاش) میں بھی فضا بندی کا یہ انداز سامنے آیا۔ اگر چہ افسانے کی تکنیک حقیقت پسندانہ ہے لیکن اس میں مستقبل کے ایک واہمے (illusion) کو بہت خوبصورتی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ مثال۔

''دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخالف! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟

یہ مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جوئیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔''

**(حوا کی تلاش)**

۳۔ فطرت کے حسین منظر یا کوئی ایک مخصوص فطری فضا افسانے کی فضا بندی کو بنیاد فراہم کرتے ہیں، انسان کے عمل یا کردار کی تفہیم فطرت کے کسی مظہر کے تناظر میں ابھرتی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان فطرت کے مد مقابل آکر اسے مغلوب کرنے کے جتن کرتا ہے اور کبھی خود اس سے مغلوب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار فطرت کی منہ زور قوت کو، بے انت پھیلے صحرا، پتھریلی سخت دھرتی، ناقابل تسخیر کوہسار، سمندر، برف باری کے طوفانوں اور ریتلی

آندھیوں، سورج اور زوردار بارشوں کے روپ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان کی کمزور جدوجہد کے سامنے یہ بذات خود منہ زور اور مجسم کردار بن جاتے ہیں حیدر قریشی کا افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' میں یہ منظر نامہ انتہائی موثر انداز میں سامنے آیا ہے۔ جہاں صحرا میں گلاب کے پھول کے ساتھ ساتھ افسانہ تشکیل پاتا ہے۔حیدر قریشی نے اپنے بعض افسانوں میں فطری ماحول کی دلکش اور موثر فضا بندی کر کے اسے افسانے کے کرداروں اور معنویت کو اجاگر کرنے کے لئے بہت کامیابی سے استعمال کیا ہے حیدر قریشی نے افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' کے استعجابیہ انجام سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں معاشی تذلیل نے جرائم کی راہ دکھائی وہیں موت تمام مسائل کا حل نظر آتی ہے۔ چاروں درویشوں کا اپنی اپنی کہانی ختم کرنا، سچ کا سامنا ہوتے ہی پیاس کی شدت کا محسوس ہونا، پانی پینا اور موت سے ہم کنار ہونا۔صرف یہی نہیں بلکہ درویش کے مرتے ہی گلاب کے پودے میں ایک سرخ پتہ کا ابھرنا۔ان واقعات سے افسانہ میں ایک عالمی منظر نامہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' سے مثال ملاحظہ ہو۔

''اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا۔۔پانی۔۔۔!

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پورا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اسے اس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔۔۔

وہ خوف سے چلایا:''پانی۔۔۔!''

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت۔۔۔پانی۔۔!''

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا، کنووں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟۔۔۔۔

پیاس کی شدت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا۔ (گلاب شہزادے کی کہانی)

فطرت اور انسان کے باہمی تعلق کے ہر دم بدلتے منظروں کی مخصوص تفصیلات کا بیان اور فضا بندی کا یہ

اسلوب حیدر قریشی کے اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور فلسفۂ زیست پر ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے تضادات اور ہم آہنگیوں کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ حیدر قریشی کے افسانوں میں فضا بندی اور ماحول کرداروں کی پرداخت، پلاٹ کی تشکیل و تعمیر اور موضوعات کی تفہیم میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ دیوندر اسّر لکھتے ہیں:

> ان کی کہانیوں کی دنیا میں ریگستان کی رنگین ریت، آکاش کے بدلتے ہوئے رنگ اور ایک ایسا دھندلا احساس بند ہے جس میں داخل ہوتے وقت ڈر لگتا ہے۔ لیکن جس میں داخل ہوئے بغیر ہماری نجات ممکن نہیں۔ دل، دماغ، روح اور نور الٰہی --- روشنی کی کرن ان کی کہانیوں میں ایک علامت بن گئی ہے جو رات کے پچھلے پہر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ تار جڑے ہوتے ہیں جن کی تخلیق نور الٰہی نے کی ہے اور کبھی یہ آشا کی کرن بن کر گلاب کے پھول میں جھلکنے لگتی ہے اور کبھی ماںمتا اور محبت بن کر دل میں بسیرا کر لیتی ہے۔ انسان خوف سے آزاد ہو جاتا ہے اور پرندوں کے پنکھ اس کو چھایا اور ہوا دیتے ہیں۔ (۱۱۵)

حیدر قریشی نے ایک مخصوص ماحول اور پس منظر میں انسانوں کو رہتے سہتے دیکھا، اس ماحول اور پس منظر کا لوگوں پر جو شعوری اور غیر شعوری اثرات مرتب ہوا، انہوں نے اس کا گہرا مشاہدہ کیا۔ وہ ان کے ظاہر اعمال اور باطنی کیفیات کے درمیان رابطے تلاش کرتے ہیں اور ان کی تفہیم کر کے اپنے تخلیقی تجربے کا حصّہ بناتے ہیں اور پھر ان کی
موزوں ترین جزئیات منتخب کر کے ان کی مدد سے ایک ایسی افسانوی فضا تشکیل کرتے ہیں جو حقیقی زندگی سے زیادہ مربوط اور دلچسپ لگتی ہے۔ جس میں سانس لیتے، حرکت کرتے عام انسان کسی بھی غیر معمولی حرکت کا ارتکاب کئے بنا اور کسی غیر معمولی ذاتی صلاحیت یا قوت کو منکشف کئے بغیر ہی دلچسپ بن جاتے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے انٹرویو میں کہا ''میری ذاتی زندگی کے سارے نشیب و فراز لاشعوری طور پر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظامِ فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے اور لاشعوری طور پر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں درآئے ہوں گے۔'' (۱۱۶)

حیدر قریشی کے کرداروں کا ہر قول و فعل ان کے اردگرد کے ماحول سے ہم آہنگ رہتا ہے، انہوں نے اس مقصد کے لئے بہت سوچ سمجھ کر مقام اور وقت کا انتخاب کیا ہے اور پھر وہ بیان کی جزئیات سے ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں کہ جس میں کرداروں کا ہر قول اور عمل اور کہانی کے سب واقعات قابل یقین لگنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک مثال

..............................................

۱۱۵۔ نذر خلیق، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء، ص، ۱۹۸۔

۱۱۶۔ سعید شباب، انٹرویوز، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص، ۹۱

حیدرقریشی کا افسانہ ''کاکروچ'' ہے۔افسانے کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

''ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیش نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔''

افسانہ میں مصنف نے جو فضا قائم کی ہے اس اقتباس کو دیکھئے:

اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحب اولاد ہو گئی ہے۔تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہی ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔

(حوا کی تلاش)

اس کہانی کا ''میں'' خود مصنف ہے۔یہاں مصنف ہمیں (قاری) کو ایسی دنیا میں لے گیا جب ایٹمی جنگ کے بعد دنیا میں صرف وہ اور ایک عورت (اس ایک عورت میں ضرور مصنف نے اپنی زوجہ کو ہی تصور کیا ہوگا) ہی بچ گئے ہیں اور تمام انسان ختم ہو چکے ہیں۔اور جب دنیا ایک بار پھر سے انسانوں سے بھرنے لگی تو ایک دن اپنے پوتوں، پوتیوں کی فرمائش پر مصنف اس پچھلی ترقی یافتہ دنیا کی کہانی سناتا ہے۔جہاں ہر طرف سہولتیں موجود تھیں۔اور جب مصنف کہانی ختم کر کے بچوں کے جھونپڑے سے نکلتا ہے تو بچے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ'' دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں۔'' مصنف کی سنائی اس کہانی پر ان کے ایک دوست نصیر حبیب سوال اٹھاتے ہیں کہ'' ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔اس لئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر بچا رہے ہیں؟'' جواب میں مصنف کا کہنا ہے کہ میری کہانی کو آپ سائنسی مضمون نہ سمجھیں۔مصنف نے اپنی بات کی وضاحت کس طرح کی ہے افسانہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لئے اس کی موت واقع ہو جائے گی لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی ایک تھیلی ہوتی ہے،اس لئے اگر اس کے اس جسم میں nuclear poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہوگی۔''

(حوا کی تلاش)

مصنف کے اس بیان کو سنتے ہی اس کا دوست اسے مکھی کی جگہ کاکروچ فرض کرنے کو کہتا ہے۔یہ سن کر مصنف کچھ الجھن محسوس کرتا ہے اور ایک دم سے ہی اسے یہ خیال آتا ہے کہ

''دوستو! ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں۔''

**(کاکروچ)**

یہ خیال افسانے کے ماحول اور فضا میں فکر کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ ایسے میں تھوڑا اس بات کا بھی شک ہوتا ہے کہ ''میں'' کی اس الجھن میں صرف خیال ہی نہیں بلکہ ان میں کچھ حقیقت بھی تھی لیکن یہ سب کچھ افسانے کی مجموعی فضا کا حصہ ہے۔

## زبان واسلوب:

کسی بھی زبان کے ادب کو سمجھنا ہو یا کسی مخصوص ادیب کے فن کی تفہیم کا معاملہ ہو اس کے سماجی، ثقافتی، علمی و تعلیمی، سیاسی اور ادبی تناظرات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ادب کا وسیلہ اظہار زبان ہے اور زبان موجود انسانی معاشرتی زندگی پر اپنے من مانے اقتدار کے باوجود دراصل انسان کی معاشرتی تاریخ ہی کی پیداوار ہے اس لئے لفظوں کی معنوی پرتیں اپنے تاریخی سماجی تناظر کے بغیر کھل ہی نہیں سکتیں۔ ادب میں تو لفظوں کا کھیل اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں لفظ اپنے روزمرہ استعمال کی طرح شفاف نہیں رہتے اور نہ ہی وہ اپنا کام کر چکنے کے بعد تحلیل ہو کر غائب ہو جاتے ہیں بلکہ ادب میں لفظ اپنی معنی خیزی کے باوجود قائم رہتا ہے۔ اور یہ لفظ ایک سمتی بھی نہیں ہوتے بلکہ ان کی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔ انسان محض زبان ہی کے ذریعے ابلاغ نہیں کرتا بلکہ زبان تو کئی دیگر نظام (اشارات/ نشانات) میں سے ایک نظام ہے۔ اسلوب اس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی فرد (فن کار) ایک مخصوص لسانی ماحول میں، کسی مخصوص مقصد کے حصول کے لئے زبان کو استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ اسلوب کو وسیع تر معنی میں زبان کی تکلمی اور تحریری، ادبی اور غیر ادبی دونوں صورتوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن روایتاً اسے تحریری زبان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

افسانہ بطور ایک متن کے الفاظ (زبان) پر مشتمل ہوتا ہے اور ہم افسانوی دنیا تک رسائی بھی زبان کے ذریعے ہی حاصل کرتے ہیں لیکن بطور ایک کہانی کے افسانہ ایک تجریدی سطح کا حامل بھی ہوتا ہے جو اصولاً اس زبان سے آزادانہ وجود بھی رکھتا ہے جس کے ذریعے یہ اظہار پاتا ہے مثلاً کہانی کو فلم یا تصویروں اور مجسموں کے سلسلے کے ذریعے بھی تو پیش کیا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی کے زیادہ تر افسانوں میں حقیقت نگاری کے روایتی اسلوب ہی کی توسیعات دیکھی جا سکتی ہیں۔ حیدر قریشی کسی تحریک یا رجحان کی پابندیوں سے بالاتر رہنے کی کوشش کرتے ہیں اس

لئے وہ کسی مخصوص موضوع تک محدود کبھی نہیں رہے، اور اسی لیے حقیقت نگاری کا اسلوب ان کے ہاں ایک دلکش تنوع کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔

حیدر قیریشی کے افسانوی اسلوب کے بارے میں درج ذیل بنیادی نکات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حیدر قریشی نے شعوری طور پر حقیقت پسندی کا اسلوب اختیار کیا۔

۲۔ ان کا اسلوب دھیما،، نرم اور اس کی نثر سبک رواں اور سادہ ہے۔

۳۔ اس میں بے رنگی اور پھیکا پن نہیں بلکہ حسن آفرینی کی صلاحیت اور دلچسپی موجود ہے۔

۴۔ ان کا اسلوب اپنے موضوع کی مناسبت سے اظہار پر قادر اور لچک دار ہے۔

۵۔ اس میں توازن، آہنگ اور تناسب کا بھرپور احساس موجود ہے۔

۶۔ اس میں ہمہ روی، دل سوزی اور ابلاغ موجود ہے۔

۷۔ کفایت لفظی اور حسن ایجاز حیدر قریشی کے اسلوب نثر کی بنیادی خصوصیت ہے۔

۸۔ افسانے کے مجموعی آہنگ کو مجروح کئے بغیر ان کے کسی جملے اور الفاظ کو قلم زد نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ حیدر قریشی کے اسلوب میں سوفٹ سا طنز دکھائی دیتا ہے۔

حقیقت میں حیدر قریشی نے فنی اور نظریاتی معروضیت اور عدم وابستگی کو ہمیشہ حاصل کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے فن کے ذریعے ہم عصر انسانی اور سماجی حقیقت کے کھرے اور واضح نقش ابھارنا چاہتے ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ زبان کا استعمال سادہ، رواں اور مترنم ہے۔ حیدر قریشی کا اسلوب اردو افسانے میں حقیقت پسندی کے اسلوب کی ایک اہم مثال ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں کی انوکھی خصوصیت ان کا سحر انگیز اسلوب ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں کی کامیابی اسی سحر کار اسلوب اور فنکارانہ مہارت میں مضمر ہے۔ حیدر قریشی کے فقروں میں توازن اور تناسب نظر آتا ہے۔ جملوں میں ایک چمک کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ چمک خارجی یا ظاہری ہرگز نہیں معنی خیز آفرینی کی صلاحیت ان جملوں میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ ایسے جملے صرف جملوں کی حد تک متاثر نہیں کرتے بلکہ افسانے کی فضا بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ مثال۔

۱۔ ''کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے۔'' **(غریب بادشاہ)**

۲۔ ’’لوگوں! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لاکر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے۔‘‘ (روشنی کی بشارت)

۳۔ ’’سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا اسی لئے ننگا نظر آتا ہے۔‘‘ (اندھی روشنی)

۴۔ ’’دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔‘‘ (روشن نقطہ)

۵۔ ’’علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے۔‘‘ (روشن نقطہ)

حیدر قریشی کے ہاں مکالمہ نگاری کی قوت ان کے ہر کردار کو قوت دیتی ہے۔مکالمہ نگاری کی یہ اثر انگیزی ماحول ،شخصیت کو سمجھنے میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ کرداروں میں بھی جان ڈال دیتی ہے ۔افسانہ کے مکالموں میں زبان کا تصور بہت وسیع ہے ۔الفاظ کے ساتھ وہ لہجہ اور تلفظ پر بھی زور دیتے ہیں ۔بعض اوقات مکالمہ نثری نظم کا سا ذائقہ دے جاتا ہے۔ علامتیں ،تشبیہات ، استعاراتی انداز حیدر قریشی کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔ جو مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ کہانی کی فضا کو آگے بڑھانے میں مددگار ہوتے ہیں۔اور وہ افسانوی کردار کی احساسات شناسی میں بھی قاری کے معاون ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

حیدر قریشی نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں روشنی کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ پہلا افسانوی مجموعہ ’’روشنی کی بشارت‘‘ ہے۔ان کے افسانوں کا تنہا فرد جو اپنی شناخت اور گمشدگی کے مسائل سے گھرا ہوا ہے،اس وقت تنہا نہیں رہ جاتا جب روشنی دائرہ بناتے ہوئے فرد کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ذکاء الدین شایان:’’تنہا، بے یارومددگار اپنے تمام جماعتی نظام، اجتماعی شعور، جمہوی اژدہام اور عوامی گروہ بندی سے الگ تھلگ، قطعی دل برداشتہ۔۔۔۔لیکن اِس تنہا ’’فرد‘‘ کے ساتھ ایک ’’روشنی بھی ہے جو اس کے چاروں طرف ہالہ کیے ہوئے ہے اور راہ دکھاتی جاتی ہے‘‘۔(۱۱۷)

حیدر قریشی نے اپنے تمام افسانوں میں روشنی کی علامت کو کئی زاویے سے پیش کیا ہے۔

۱۔ حیدر قریشی کے افسانوں میں روشنی ایک کلیدی استعارہ ہے۔ جو کہ ان کے افسانوں کے کینوس کو وسیع کر کے ان کی معنویت کے نئے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں روشنی رہنمائی کرتی ہوئی پیغمبرانہ روشنی کی

.................................

۱۱۷۔ نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑبولے،(مرتبین) حیدر قریشی فن اور شخصیت، پونہ: اسباق پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء، ص،۹۱۔

صورت میں موجود ہے۔ یہ روشنی علامتی استعاراتی اور تلمیحی زاویوں کے ساتھ چھائی ہے۔افسانہ ''روشنی کی بشارت'' کا مرکزی کردار (جوحیدرقریشی خود ہیں) شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر اعلان کرتا ہے۔

''لوگو!تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لاکر خود کو روشنی سے محروم کرلیا ہے۔
نورِبصیرت سے محروم لوگو!تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے''

**(روشنی کی بشارت)**

''اچانک ساری روشنیاں گل ہوگئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہوگیا ہے۔'تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے' میں اس سے کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آ گئی ہیں،میرا اندھا پن بھی آ گیا ہے۔''

**(اندھی روشنی)**

''روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک ہالے کی شکل اختیار کرگئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے''

**(حوا کی تلاش)**

''روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے:
اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کروگے؟''

**(حوا کی تلاش)**

۲۔ حیدرقریشی اپنے بعض افسانوں میں اس روشنی کو بہت عقیدت و احترام سے بیان کرتے ہیں افسانہ ''ایک کافر کہانی'' میں مذہبی افکار وعقاید کا پرتو نظر آتا ہے۔''حوا کی تلاش'' میں حیدرقریشی نے بتایا ہے کہ انسان جب خدا کے سامنے خود سپردگی کے احساس سے گزرتا ہے تو روشنی اس کے باطن میں نمودار ہونے لگتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے عظیم جذبے سے گزر کر انکشافِ ذات تک پہنچتا ہے۔روشنی کا ایک انداز یوں بھی ہے۔

''روشنی کی ایک لکیر میرے اندر سے پھوٹی اور مجھ پر منکشف ہوا کہ میں ہی پنوں تھا۔
جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس کھنڈر تک پہنچ گیا ہوں لیکن روشنی کی لکیر جو میرے اندر سے پھوٹی تھی، وہ ایک دائرہ بن کر مجھے منور کرنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا۔ میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا۔۔۔۔''

**(ایک کافر کہانی)**

۳۔کہیں یہ روشنی ضمیر کو روشن کرتی نظر آتی ہے۔ جو انسان کو سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔کہانی ''اندھی روشنی'' میں حیدر

قریشی نے اس سچ کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ دنیاوی عیش و آرام اور آسائشیں حاصل کرنے کی ہوس میں انسان اندھا ہو جاتا ہے، اپنے ضمیر اور باطنی سچائیوں کی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً افسانہ ''آپ بیتی'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔
گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے لگتا ہوں تو اچانک
روشنی میں نہا جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں
رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔
میرے چاروں طرف گھور اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟
کہیں یہ میرے اندر کی روشنی تو نہیں؟۔۔۔۔۔ میرے شجرے کی روشنی؟۔'' (آپ بیتی)

حیدر قریشی نے روشنی کو استعارے کی صورت میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ افسانوں کے عنوانات میں بھی روشنی کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ اپنے اندر روشنیوں کے کئی انداز لئے ہوئے ہیں۔ مجموعہ ''افسانے'' میں ''روشنی کی بشارت، اندھی روشنی اور روشن نقطہ'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ان کے افسانوں میں عہد جدید کے جن مسائل کو پیش کیا گیا ہے ان سے نجات پانے کے لئے روشنی سے بہتر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس گھٹن بھری مادہ پرست دنیا میں جہاں انسان کے دلوں کو سیاہ کر دیا گیا ہے، ضمیر کے اس اندھیرے کو ایمان کی روشنی سے ہی منور کیا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانے کا کردار جب بھی اپنی زمین سے، تہذیب و تمدن سے یا پھر اپنی اصل کو بھولنے لگتا ہے حیدر قریشی ٹھیک اسی وقت روشنی کا چراغ جلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں کچھ افسانوں کے اختتام مثال کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں:

اس قطرہ کے میرے اندر جاتے ہی میرے اندر روشنی سی بھر گئی۔ میری انا سے تکبر کی ساری گرد اُتر گئی اور پھر میری انا اس روشنی میں ڈوب گئی۔
اس روشنی میں، میں نے آنے والے تمام دنوں کو دیکھ لیا۔ اور میرے چہرے پر اطمینان کا نور پھیل گیا۔
تب ہی وہ منجمد لمحہ پگھل گیا جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔

(بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے)

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے، ''اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

(حوا کی تلاش)

پیر سائیں اور مجذوب دونوں ایک نقطے میں ڈھل گئے تھے۔
اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی پھوٹ رہی تھی۔
اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی! **(روشن نقطہ)**

بقول جیلانی کامران:

افسانے کی اس دنیا میں جسے حیدرقریشی نے دریافت کیا ہے۔ روشنی کی کرن ایک ایسا استعارہ ہے جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ روشنی کی کرن رات کے پچھلے پہر ظاہر ہوتی ہے۔کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ رشتے آشکار ہوتے ہیں جن کی ترتیب آسمانی نشانات نے کی ہے۔ اور کبھی یہ کرن امید بن کر گلاب کے پودے کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت بن کر دل میں ظہور کرتی ہے۔ یہ کرن کشف اور رویا بن کر دل کا خوف دور کرتی ہے اور سفید پرندوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے انسانوں کو وحدت کی دعوت دیتی ہے۔حیدرقریشی نے اس استعارے کو جابر ماحول سے رہائی پانے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تاہم یہ استعارہ جہاں ماحول اور فطرت اور آرزوئے قلب میں ظاہر ہوتا ہے وہیں اس استعارے کی توانائی اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ اس استعارے کو الہامی اور آسمانی نشانات نے آل آدم کی تربیت میں نسل در نسل راسخ کیا ہے۔ اس لیے روشنی کی کرن نہ تو گم ہوتی اور نہ دجل و بطلان کے دبیز پردے اسے آنکھوں سے اوجھل رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے آخری سہارے کے طور پر یہ استعارہ انسان کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے حیدرقریشی نے اس استعارے کو اپنے افسانوں میں مجسم کیا ہے اور اس کی مدد سے اپنے مرکزی کرداروں اور ضمیر متکلم کی تشکیل کی ہے۔ اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو حیدرقریشی کے افسانے انسان کی امکانی صورتحال کو پیش کرتے ہیں اور یوں روشنی کی کرن کو انسانی فلاح کا مرجع قرار دیتے ہیں۔ (۱۱۸)

افسانہ ''حوا کی تلاش'' میں روشنی کی کرن جدید عہد کی ٹیکنالوجی کے ہمراہ ایک نئے زمانے کی نیو رکھتی ہے۔افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' میں گلاب کا پھول انسان کی ابدی حکمرانی کا استعارہ ہے۔ یہاں انسان کی ہوس اور نظام زیست کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں روشنی کی کرن کے ذریعہ ایسے اشارے ملتے ہیں جو انسان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ دیوندر اِسّر لکھتے ہیں:

روشنی کی کرن کی اسی آرزو، اسی تلاش سے ان کی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ روشنی کی کرن ان کی کہانیوں کی مرکزی علامت ہے جس کے پرت در پرت کھلنے سے ان کا ضمیر اور کُل کائنات نورانی خزانہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تلاش باہر کے آدمی کو بھیتر کی دنیا میں لے جاتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام، نہ کوئی کنارا، نہ حد اور نہ طول و عرض! بس خلا ہی خلا

---

۱۱۸۔ نذر خلیق، حیدرقریشی کی ادبی خدمات، راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۹۔۱۹۰۔

ہے،سپیس ہی سپیس ہے، وقت ہی وقت ہے۔ (۱۱۹)

فنی سطح پر ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جونمایاں تبدیلیاں ہوئیں ان میں داستانی انداز اور اسطوری علامتوں نے بھی افسانے کی زبان پر خاصا اثر ڈالا۔حیدرقریشی نے عہد جدید کی ابتری، بدحالی اور بگاڑ کی تصویر کشی کے لیے قدیم داستانوی انداز بیان اپنایا۔اورتہذیب وروایت سے جڑے ہونے کی وجہ سے انھوں نے صنفِ جدید کو کلاسیکیت کے پیرائے میں نہایت عمدہ طریقہ سے پیش کیا۔کبھی وہ اسلامی تاریخ کے بعض ادوار یا عقائد سے متعلق علامتوں کو اپنی کہانیوں میں سموتے ہیں،تو کبھی ان کی کہانیوں کا تعلق مذہبی اساطیر سے جڑ جاتا ہے داستانی رنگ کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کے اظہار کے لیے مذہبی اساطیر کو حیدرقریشی نے اپنی کہانیوں کا خاص حصہ بنایا۔انہوں نے افسانوں میں ایک ایسا تلمیحاتی واستعاراتی نظام قائم کیا ہے جوموجودہ عہد میں معدوم ہوتا جارہے ہیں۔انسان کوتعلیم یا سبق دینے کے لئے پوری کائنات موجود ہے۔وید،قرآن اورانجیل کی تعلیمات کے باوجود انسان ابھی تک اپنی خواہشوں سے آزادنہیں ہوسکا ہے۔اس کی وحشی خواہشیں ہر وقت اسے گھیرے ہوئے ہیں۔حیدرقریشی کے افسانوں ( گلاب شہزادے کی کہانی ، روشنی کی بشارت ، میں انتظار کرتا ہوں،ایک کافر کہانی ،حوا کی تلاش ، روشن نقطہ ) میں ہمیں یہ دکھ دیکھنے کو ملتا ہے۔کائناتی حقیقت کوآج کا انسان کبھی نظرانداز کرتا ہے تو کبھی اس کی صداقت کا احساس اسے ہوتا ہے ،حیدرقریشی کے افسانے انہیں کیفیات کا فنی اظہار ہیں ۔انہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے انسانی تاریخ یا اسلامی تاریخ کی حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔افسانہ'' گلاب شہزادے کی کہانی'' اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں داستانی طرز بیان خاص طور پرنظرآتا ہے۔افسانہ میں شامل کردار ( چار درویش )'' قصہ چہار درویش'' کی یادتازہ کرتے ہیں۔افسانہ نگار نے داستانی اور تلمیحی رموز کا سہارا لے کر زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا ہے۔اورانسان کے توہمات، جادوٹونے ،اورمعجزاتی اعمال کی فضا کوعلامتی رنگ میں پیش کیا ہے۔

اس کا آدھاجسم باہر پڑاتھا۔سر پانی کے چشمے میں ڈوباہواتھا۔پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر۔۔۔۔
اور لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے ہوئے تیر رہے تھے۔اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔
گلاب کے پودے پرایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔گلاب کے اس پھول کا رنگ غیرمعمولی حدتک گہرا سیاہ تھا۔
گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہوچکی تھی۔مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا۔ (گلاب شہزادے کی کہانی)

..............................

۱۱۹۔ نذرخلیق ،حیدرقریشی کی ادبی خدمات ،راولپنڈی:میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳،ص ۱۹۵۔

یہ کہانی یا اس طرح کی دیگر کہانیاں اپنے آپ میں ایک مکمل تاریخی حقیقت بھی لے کر چلتی ہیں ۔ جیسا کہ ڈاکٹر قمر رئیس حیدر قریشی کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔''یہ کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر کہانیوں سے الگ اور انوکھی ہیں ۔ یہاں تاریخ گنگناتی ہے انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکارتے ہوئے نکلتے ہیں ۔'' (۱۲۰) حیدر قریشی نے افسانوں میں قرآنی آیات کا استعمال نہایت سلیقے سے کیا ہے ۔انہوں نے اپنی فکر کو قرآن اور اسلام کے پس منظر میں بھی دیکھنے کی سعی کی ہے ۔

وقت کی ماہیت کا احساس بھی ان کے افسانوں ( میں انتظار کرتا ہوں ،روشنی کی بشارت ،کاکروچ ،گلاب شہزادے کی کہانی ،حوا کی تلاش ،روشن نقطہ ) میں نمایاں ہے ۔ یہاں ماضی ،حال اور مستقبل باہم مربوط ہو کر ایک سیال کیفیت بن گئے ہیں ۔حیدر قریشی کی کہانیاں انسان ، خدا اور کائنات کے ازلی سوالوں سے قائم ہوتی ہیں ۔'' میں انتظار کرتا ہوں'' میں انہوں نے تین اہم کرداروں کو ایک کردار میں یکجا کر دیا ہے ، جبکہ دیگر افسانوں میں ان کے یہاں وقت کی ماہیت پر ان کی فکر نظر آتی ہے ۔

''مجھے اب پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں ۔

مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس

برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں .... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی ۔اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چارسو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چارسو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا ۔اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں ۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں ۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے ۔جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہو گی ۔

(روشنی کی بشارت)

اس اقتباس میں انسان اپنے وجود کا راز جاننے کی جستجو میں ہے ۔ اس کی کوشش میں وہ کبھی تاریخ میں خود کو تلاش کرتا ہے کبھی حال کی تہوں کو ٹٹولتا ہے اور کبھی مستقبل میں خود کو تلاش کرتا ہے ۔تلاش و تجسس کی یہ زنجیر گذشتہ کو حال اور آئندہ سے وابستہ کرتی ہے ۔اس اعتبار سے ان افسانوں میں وقت ایک غیر منقسم کل کی صورت میں موجود ہے ۔ یہاں نہ حال ماضی کی ضد ہے اور نہ مستقبل حال کی ۔

..............................................

۱۲۰۔ نذر خلیق ،حیدر قریشی کی ادبی خدمات ،راولپنڈی: میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ ،ص ،۲۰۸ ۔

## تکنیک:

حیدرقریشی کی انفرادیت تکنیک کی سطح پر بھی واضح طور پرنظرآتی ہے۔افسانہ میں تکنیک کا اہم رول ہوتا ہے۔تکنیک وہ وسیلہ ہے جس کے سہارے افسانہ نگارفن کاری سے مواد کوافسانہ کی شکل میں تبدیل کرتا ہے۔افسانے میں کسی خاص تکنیک کے استعمال کے لئے افسانہ نگار کا نقطہ نظر بہت اہمیت رکھتا ہے۔اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے اس کے پاس کئی طریقے ہوتے ہیں۔ممتاز شیریں تکنیک کے متعلق لکھتی ہیں:'' تکنیک کی صحیح تعریف ذرامشکل ہے۔مواد،اسلوب،ہیئت سے ایک علیحدہ صنف۔فن کار مواد کواسلوب سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک مخصوص طریقہ سے متشکل کرتا ہے۔افسانے کی تعمیر میں جس طریقہ سے مواد ڈھلتا جاتا ہے وہی تکنیک ہے۔''(۱۲۱)

حیدرقریشی نے افسانوں میں موضوعات کی مناسبت سے مختلف تکنیک کا استعمال کیا ہے۔فنی اعتبار سے ان کی بیشتر کہانیاں سادہ بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔حیدرقریشی ۱۹۷۰ءاور۱۹۸۰ء کی دہائی کے اردوافسانے کا ایک اہم نام ہیں۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو افسانے کا اسلوب جب علامت اور تجریدیت کے منطقوں سے گزر رہا تھا،انہوں نے اس کا کہانی پن سے رشتہ برقرار رکھا۔نذرخلیق کو دئے اپنے انٹرویو میں حیدرقریشی کہتے ہیں''میں نے تب افسانے کی دنیا میں قدم رکھا جب وہاں نوبت تجریدی ماراماری تک پہنچ گئی تھی۔۔۔۔میں نے کہانی لکھتے ہوئے کہانی پن کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔میں ان لوگوں کوٹھیک نہیں مانتا جنہوں نے جان بوجھ کر افسانہ میں کنفیوژن پیدا کئے۔(۱۲۲)حیدرقریشی نے زیادہ تر افسانے بیانیہ تکنیک میں لکھے ہیں۔بیانہ دراصل ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس میں تسلسل وروانی کے ساتھ ساتھ خیال کی پیش کش کواہمیت دی جاتی ہے۔جس میں مکالمہ،کردار،سماجی وسیاسی سیاق و سباق سب کچھ موجود ہوتے ہیں۔بیانیہ قصہ کے کئی طریقے ہیں۔ان کے افسانوں میں جوطریقہ نظرآتا ہے وہ خود کلامی، فلیش بیک اور تلازمہ خیال ہے۔انہوں نے افسانہ(مسکراہٹ کا عکس،حوا کی تلاش،مامتا،آپ بیتی،میں انتظار کرتا ہوں) میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں میں کردار بیک وقت ماضی ،حال اور مستقبل میں سفر کرتے ہیں۔فلیش بیک کی تکنیک میں راوی یا تو کرداروں کے ذریعہ ماضی میں سفر کرتا ہے یا پھر مسلسل تبصرے کی تکنیک اپنا کر کرداروں کے ذہنی وقوعات کو پیش کرتا ہے جس میں خود کلامی کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔

.......................................................

۱۲۔ گوپی چند نارنگ،(مرتب)،اردوافسانہ روایت اور مسائل،دہلی:ایجوکیشنل بک ہاوس،۱۹۸۱ء،ص۴۶۔

۱۲۲۔ سعید شباب،(مرتب)انٹرویوز،ہالینڈ:نظام آرٹ اکیڈمی،۲۰۰۴،ص۱۱۲۔

بقول انتظار حسین: ''ذہن حال کے نقطے سے چل کر ماضی کے اندھیرے میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے اور کبھی آگے چل کر مستقبل کے راستے پر چلتا ہے اور کبھی حال کے کیلی کے گرد گھومتا ہے۔ (۱۲۳)

ممتاز شیریں مونولاگ (خود کلامی) تکنیک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ایک اور تکنیک خطوط کی ہے اگر ان افسانوں میں یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ خط ہیں تو مونولاگ بن جاتے ہیں۔ایک آدمی اپنی باتیں اور دوسروں سے کہی جانے والی باتیں تفصیل سے سنا تا ہے اگر یہ باتیں کہیں جائیں تو افسانہ مونولاگ بن جاتا ہے لکھی جائیں تو خط۔مونولاگ میں بیان کرنا یا خط کی صورت میں لکھنا بڑی آسان تکنیک ہے لیکن اس سے افسانہ بڑا اثر انگیز ہو جاتا ہے۔(۱۲۴)

اس تعریف کو مدِنظر رکھتے ہوئے حیدر قریشی کے افسانوں کا تبصرہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے افسانہ ''مسکراہٹ کا عکس''میں خود کلامی کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔افسانہ کا واحد متکلم خود اپنے آپ سے ہی بات کرتا چلا جاتا ہے۔اس سلسلے میں قیصر تمکین لکھتے ہیں:

حیدر قریشی کی ایک واضح خصوصیت تو مجھے یہ نظر آتی ہے کہ ان کے یہاں غیر ارادی طور پر جدید امریکی ''تخلیقی تحریروں'' کے دبستان کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ممکن ہے قریشی صاحب خود مجھ سے متفق نہ ہوں۔لیکن میرے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مکالماتی تحریروں میں وہ ڈیوڈ لاج یا اُن کے رفقاء کے انداز کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ہمارے کہانی کاروں میں یہ انداز تا حال مفقود ہے۔خیر تو کہنا یہ ہے کہ حیدر قریشی کا مخصوص مکالماتی انداز جسے انگریزی میں Monologue کے ڈھنگ پر واحد متکلم بیشتر اوقات استفہامیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے،ڈیوڈ لاج ہی نہیں بلکہ بے جادہ و منزل نسل Biat Generation کے دائروں سے بھی ٹکراتا دکھائی دیتا ہے۔حیدر قریشی کا مخصوص مکالماتی انداز جسے انگریزی میں مونولاگ کے ڈھنگ پر واحد متکلم بیشتر اوقات استفہامیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔(۱۲۵)

شعور کی رو کو قابو میں رکھنے کے لیے تلازمہ خیال کے اصول کو عمل میں لایا جاتا ہے۔خیال سے خیال،تلازموں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ایک تلازمہ دوسرے تلازمہ کو جنم دیتا ہے۔اس طرح خیالات کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔حیدر قریشی کا افسانہ (غریب بادشاہ،دھند کا سفر) اس کی اچھی مثال ہے۔راوی کردار کی صورت میں خیال کی بھول بھلیا

.....................................

۱۲۳۔ شب خون،مارچ ۲۰۰۲،ص ۶۰۔

۱۲۴۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان،اردو مختصر افسانہ:فنی و تکنیکی مطالعہ،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۶ء،ص ۳۶۔

۱۲۵۔ نذر خلیق،حیدر قریشی کی ادبی خدمات،راولپنڈی:میاں محمد پبلیشرز ۲۰۰۳ء،ص ۲۰۰۔۲۰۱۔

میں کھویا نظر آتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے بعض افسانوں میں توصیفی اندازِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ افسانہ (مسکراہٹ کا عکس، مامتا، آپ بیتی، کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار) میں حیدر قریشی نے واحد متکلم میں واقعات کا بیان کیا ہے۔ جیسے وہ واقعات خود ان کی زندگی میں پیش آئے ہوں۔ اسے آپ بیتی بھی کہتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود کہانی کار کی ذات اس میں پوشیدہ ہے۔

مختصراً یہ کہ حیدر قریشی بنیادی طور پر شاعر ہیں، اس لیے لفظوں کی جادوگری سے قاری کو اسیر بنانے کے فن پر ان کی گرفت مستحکم ہے ان کی ہر صنف میں یکساں روانی ملتی ہے۔ ان کی نثر میں فطری روانی اور بے ساختگی بھری پڑی ہے۔ ان کی نثر پڑھتے ہوئے قاری کو کسی بھی قسم کی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنی مادری و پدری زبانوں (پنجابی اور سرائیکی) کا بھی استعمال کیا۔ حیدر قریشی کی ایک واضح خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر کہانی کی ابتدا شعر سے کی ہے۔ تحریر کا یہ طرز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہت رائج تھا، جسے حیدر قریشی نے ایک بار پھر استعمال کیا ہے۔ حیدر قریشی نے ہر نفس مضمون کی وضاحت کے لئے خود اپنے کہے اشعار کو پیش کر کے انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔

حیدر قریشی گزشتہ بیالیس سال سے برابر لکھ رہے ہیں۔ اور ان کا قلم ابھی تک تھکا نہیں ہے، آدمی اندر سے زندہ ہو تو عمر و سال کی مسافت اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی بلکہ تجربات و مشاہدات کے سرمایہ سے مالا مال کر کے اس کے فن کو کچھ اور توانا کر دیتی ہے، حیدر قریشی کی بھی یہی صورت ہے۔

# اختتامیہ

ادب تحریک کا نام ہے۔اس حوالے سے انسانی فکر کبھی بھی سکون کی حالت میں نہیں رہتی۔ یہ ایک بحرِ اضطراب ہے۔ادب کی تخلیق ہر دور میں جاری و ساری ہے۔ ماحول اور اس سے وابستہ اقدار سے مواد حاصل ہوتا ہے۔ ماحول، خیالات، رجحانات اور معاشرے میں نت نئی ابھرتی ہوئی تحریکیں انسانی مزاج پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ادیب معاشرے کا حساس رکن ہوتے ہوئے ان تبدیلیوں کو جذب کرتا ہے اور پھر ان کی عکاسی اس کی تحریر کرتی ہے۔حیدر قریشی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے ماحول اور سماجی رسم و رواج کو ساتھ لے کر اپنی انفرادیت کی خواہش لیے مشکل راہ کا انتخاب کیا۔۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ علم و ادب کی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بڑا ہنگامہ خیز تھا۔نت نئی ایجادات، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، طب، حیاتیات اور سائنس کے میدان میں چونکا دینے والے انکشافات مثلاً بگ بینگ، بوٹ سٹریٹ تھیوری، ڈی۔این۔اے کی مخصوص گرامر وغیرہ نے انسان کو ذہنی طور پر الجھا کے رکھ دیا۔فرد کے اندر پرانی اقدار کے ٹوٹنے اور قدیم نظریات کے ریزہ ریزہ ہو جانے سے تشکیک کا عمل ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔نتیجتاً انسانی رویوں نے بھی نیا چولا پہننا شروع کر دیا۔ بے جا سماجی و معاشی پابندیاں ناروا محسوس ہونے لگیں اور اس بوجھ سے آزادی کی کوشش ہر میدان میں ہونے لگی۔ان سب عوامل نے مل کر فرد کی ذہنی صلاحیت اور فکری و علمی استعداد پر گہرا اثر ڈالا۔صنعتی نظام، مادیت پرستی، وسیع ذرائع ابلاغ اور رسائل کی فراوانی پر انسانی زندگی میں جو کاروباری رویّے در آئے تھے۔جدید افسانہ نگار نے ان سب رویوں کو خاص طور پر محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں میں مشاہدے کا بھرپور اظہار بھی کیا۔ اس طرح پرانے نظریات اور قدیم تصورات کو نظر انداز کر کے حقائق کو ایک نئے زاویے سے جانچنے پرکھنے کے عالمی رویہ کی بنا پر ادب میں نئے راستوں کی تلاش کا رجحان فروغ پانے لگا۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل سامنے آئی، ابتدا میں یہ نسل قریب ترین پیش رو یعنی ۱۹۶۰ء کے بعد کی نسل سے متاثر ہو کر علامتی اور تجریدی افسانے لکھتی رہی۔لیکن رفتہ رفتہ ان افسانہ نگاروں نے محسوس کیا

کہ علامت نگاری افسانے کے فن کو متاثر کر رہی ہے اور قاری اس سے دور ہو رہا ہے، لہٰذا انہوں نے اردو افسانے کو ایک نئے تجربے سے آشنا کیا، یہ تجربہ ترقی پسند اور جدید انداز نظر کے میل سے بنا۔اس طرح ترقی پسند اور جدید افسانوں کی صالح خصوصیات کو مجتمع کر کے افسانہ لکھنے کا رجحان عام ہوا۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے فرد کے داخلی جذبات کے علاوہ عصری، سماجی اور سیاسی مسائل کی بھی عکاسی کی۔۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں نے جدیدیت کی خوبیوں کو اپنایا۔انور سجاد، سریندر پرکاش اور انتظار حسین کے تجربات سے فائدہ اُٹھایا اور منٹو، کرشن چندر کے فن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں کو نکھارا اور اپنی انفرادیت قائم کی۔حیدر قریشی کے ہاں بھی ہمیں یہی رنگ نظر آتا ہے۔

یورپ میں مقیم حیدر قریشی عصرِ حاضر کے باشعور اور حساس اردو افسانہ نگار ہیں۔حیدر قریشی اردو فکشن کے افق پر چھائے ہوئے ہیں۔انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور جلد ہی اپنی ذہانت اور عمدہ صلاحیت سے بلند مقام حاصل کر لیا۔ان کے پاس افسانہ لکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔وہ انسانی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔مرکب اور تہہ دار صورتحال پیدا کرنا جانتے ہیں۔اور سب سے بڑھ کے یہ کہ ان کے پاس اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔حیدر قریشی کے لیے زمانہ بہت پھیل چکا ہے ان کی ایک دنیا میں کئی دنیائیں سانسیں لیتی ہیں۔حیدر قریشی کے گہرے مشاہدے اور دردمند تخلیقی احساس نے ہمارے سماجی ڈھانچے کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ان کے افسانے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔حیدر قریشی نے انسانی زندگی اور معاشرت کو ایک حقیقت پسند تخلیق کار کی آنکھ سے دیکھا ہے اور انسانی و سماجی زندگی ان کے پیش نظر رہی ہے، وہ اپنے افسانوں میں ایسے افراد کی زندگیوں کے نقش ابھارتے ہیں جو عام ہیں اور زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔حیدر قریشی افسانے میں کردار کی تخلیق اور پیش کش کے بارے میں بڑے واضح تصورات رکھتے ہیں۔اور خود اپنی زندگی کے تجربے اور مشاہدے پر بھروسہ کرتے ہیں۔وہ زندگی اور انسانوں کو ایک آزاد خیال انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔زندگی میں انسان اور افسانے میں کردار کی ان کی نظر میں بڑی اہمیت ہے۔

حیدر قریشی کا فکری اور فنی کینوس بہت وسیع ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں ایسے عناصر کو جگہ دی ہے جو مفہوم کی کئی سطحیں کھولنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں میں درد کی ایک لہر نظر آتی ہے، ایسی لہر جن کے پیچھے زندگی کی گہری معنویت چھپی ہوئی ہے۔حیدر قریشی کے افسانے زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتے

ہیں لیکن جلد ہی ان میں مذہبی ،عقیدتی اور روحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے ۔حیدرقریشی نے بیانیہ، استعاراتی اور علامتی کہانیاں لکھی۔فنی اعتبار سے اکثر کہانیاں سادہ بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔استعاروں کا استعمال خوبصورتی سے کیا ہے۔فنی اعتبار سے یہ استعارے قاری کے لیے الجھن کا باعث نہیں بنتے بلکہ اپنے اندر معانی کی کئی جہت لیے ہوتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور جدیدیت کی مشینی زندگی ان کے افسانوں میں علامت کا روپ دھار لیتی ہے۔حیدرقریشی کی کہانیوں میں علامت کا مقصد صرف علامت نگاری نہیں بلکہ کہانی کو پیش کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔حیدرقریشی نے عہد جدید کی ابتری ، بدحالی اور بگاڑ کی تصویرکشی کے لیے قدیم داستانوی اندازِ بیان اپنایا۔تہذیب و روایت سے جڑے ہونے کی وجہ سے انھوں نے صنفِ جدید کو کلاسیکیت کے پیرائے میں نہایت عمدہ طریقہ سے پیش کیا۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔زبان کا استعمال سادہ ، رواں اور مترنم ہے۔بعض اوقات مکالمہ نثری نظم کا سا ذائقہ دے جاتا ہے۔ڈرامائی اندازِ بیان ہے۔ان کی تحریر کا ہر جملہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔غیرضروری بیان سے ممکن حدتک گریز کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدرقریشی اردوادب کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی فنی اور فکری بصیرت کے سبب منفرد شناخت بنائی ۔حیدرقریشی نے خود کو کسی فن یا اسلوب سے باندھے نہیں رکھا بلکہ ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ان کے افسانوں میں اچھے افسانوں کی بیشتر خصوصیات مطالعہ پزیری،افسانویت،تجسّس ، پلاٹ، گہرا مشاہدہ،عمیق تجربہ،سماجی شعور،عصری حسیّت ، گہری بصیرت اور کہانی کہنے کا سلیقہ موجود ہے۔ ان کا واحد مقصد ادبی جستجو، نئے روشن افکار و امکانات اور حق صداقت کی پہچان کرنا ہے۔حیدرقریشی نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں رجحانات کا مشاہدہ کیا اور مابعد جدیدیت کے دور میں رہ کر خود کو کسی بھی قسم کے نظریہ سے آزاد بھی رکھا۔ان کا ماننا ہے کہ انسان کے اندر کی آواز سب سے مستند ہے،اگر تخلیق کار کو یہ آواز سنائی دے رہی تو اسے کسی اور سے سند لینے کی ضرورت نہیں۔ان کا یہ نظریہ انہیں بھیڑ سے الگ کرتا ہے۔ ان کے افسانے انسانی زندگی کے حال ،ماضی اور مستقبل کی کہانیاں سناتے ہیں۔حیدرقریشی اپنے افسانوں میں اسلوبیاتی تنوع اور فکری ہمہ گیری کی بدولت اردو افسانہ نگاری میں ایک معتبر مقام رکھتے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ادب کی کہکشاں کے تابندہ ستارے کی طرح ان کی تخلیقات اپنی ضوفشانیوں سے نئی منزلوں کا سراغ دیتی رہیں گی۔

# کتابیات

بنیادی ماخذ:(Primary source)

قریشی،حیدر،اردو ماہیا تحقیق وتنقید،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء
قریشی،حیدر،افسانے ،دہلی:معیار پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء
قریشی،حیدر،ایٹمی جنگ ،دہلی:معیار پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء
قریشی،حیدر،تاثرات،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲ء
قریشی،حیدر،حاصل مطالعہ،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء
قریشی،حیدر،خبر نامہ،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء
قریشی،حیدر،روشنی کی بشارت،اسلام آباد:تجدید اشاعت گھر،۱۹۹۲ء
قریشی،حیدر،سوئے حجاز،جرمنی:سرور ادبی اکادمی،۲۰۰۴ء
قریشی،حیدر،عمر لا حاصل کا حاصل،دہلی:معیار پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء
قریشی،حیدر،منظر اور پس منظر،جرمنی:سرور ادبی اکادمی،۲۰۰۴ء
قریشی،حیدر،وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت(مضامین)،خان پور:نایاب پبلی کیشنز،۱۹۹۹۵ء

ثانوی ماخذ:(Secondry sources)

آغا وزیر،ڈاکٹر،دائرے اور لکیریں،لاہور:مکتبہ خیال،۱۹۸۶ء
احمد،خورشید،جدید اردو افسانہ(ہیئت واسلوب میں تجربات کا تجزیہ)،علی گڑھ:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۷ء
اعظمی،منظر،اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ،لکھنؤ:اُتر پردیش اردو اکادمی،۲۰۰۹ء
اشرفی،وہاب،معنی کی تلاش،دہلی:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۸ء
اکرام،صبا۔جدید افسانہ چند صورتیں،کراچی:فکشن گروپ آف پاکستان،۲۰۰۱ء

انجم،شفیق،اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں،اسلام آباد، یورپ اکادمی،۲۰۰۸ء
بیگ،مرزا حامد،افسانے کا منظر نامہ،لاہور:اورینٹ پبلیشرز،۲۰۱۲ء
جعفر،مہدی،اردو افسانے کے افق،لکھنؤ: نصرت پبلشرز،۱۹۸۳ء
جعفر،مہدی،افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں،نئی دہلی،معیار پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء
جعفر،مہدی،نئی افسانوی تقلیب،نئی دہلی،معیار پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء
جمیل اختر مجی،ڈاکٹر،فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۲ء
حامد حسین،سید،جدید ادبی تحریکات وتعبیرات،دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۲ء
حسن،سیّد شبیہ،اردو شعر وادب کے سفیر،لاہور:اظہار سنز اردو بازار،۲۰۱۰ء
حسن،محمد،جدید اردو ادب،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۷۵ء
حنفی،شمیم جدید۔جدیدیت کی فلسفیانہ احساس،مکتبہ جامعہ،۱۹۷۸ء
خان،نگہت ریحانہ۔اردو مختصر افسانہ:فنی وتکنیکی مطالعہ،دہلی: کلاسیکل پریٹرز،۱۹۸۶ء
خلیق،نذر،حیدر قریشی کی ادبی خدمات، پاکستان:میاں محمد بخش پبلیشرز،۲۰۰۳ء
رئیس،قمر،نیا افسانہ مسائل اور میلانات (مرتب)،دہلی:اردو اکادمی،۱۹۹۲ء
شباب،سعید،حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز، ہالینڈ: نظامیہ آرٹ اکیڈمی،ایمسٹرڈم،۲۰۰۴ء
عاشور کاظمی،،سید،بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں،،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۲ء
عائشہ سلطانہ،ڈاکٹر،مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ،(۱۹۴۷ تا حال)،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء
عظیم،وقار،فن افسانہ نگاری،علی گڑھ:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۹ء
عظیم،وقار،نیا افسانہ،علی گڈھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۲ء
عظیم،وقار،داستان سے افسانے تک،علی گڈھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۴ء
علوی،وارث،جدید افسانہ اور اُس کے مسائل،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۱ء
فاروقی،شمس الرحمٰن،افسانہ کی حمایت میں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۷۲ء
فتح پوری،نذیر اور سنجئے گوڑ بولے،حیدر قریشی فن اور شخصیت، پونہ:اسباق پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء

فتح پوری،فرمان ،اردوافسانہاورافسانہ نگاری،دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۷۵ء

کاشمیری،شورش،تحریک ختم نبوت ،لاہور:مطبوعات چٹان ،۲۰۰۳ء

منظر،شہزاد،جدیداردوافسانہ،کراچی: منظر پبلی کیشنز ،۱۹۸۲ء

نارنگ ، گوپی چند، نیااردوافسانہ انتخاب تجزیئےاورمباحث ،دہلی:اردواکادمی،۱۹۸۸ء

نارنگ ، گوپی چند،اردوافسانہ روایت اورمسائل ،دہلی:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۱ء

نارنگ ، گوپی چند( مرتب ) ، نیااردوافسانہ ، دہلی:اردواکادمی ،۲۰۱۰ء

نارنگ ، گوپی چند( مرتب )،اردوکی نئی بستیاں ،دہلی: ساہتیہ اکادمی ،۲۰۰۶ء

وارث،علوی ، جدیدافسانہاوراس کےمسائل ،دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲۰۱۱ء

وسیم انجم ،محمد،حیدرقریشی فکروفن ،راولپنڈی:انجم پبلیشرز ۱۹۹۹ء

رسائل:(Magazines)

’’ادب ساز‘‘ ، دہلی ،شمارہ: جنوری تا جون ۔ ۲۰۰۸

’’اسباق‘‘( گوشۂ حیدرقریشی )پونہ شمارہ: فروری تااپریل ۔۱۹۹۳

’’کائنات‘‘ ،شمارہ:مئی ۔۲۰۰۴

’’جدیدادب‘‘ ، جرمنی ،شمارہ:امئی ۱۹۹۹ء

’’جدیدادب‘‘ ، جرمنی ،شمارہ:۲مئی ۲۰۰۰ء

’’عکاس‘‘( حیدرقریشی نمبر )،اسلام آباد،شمارہ: ۵ کتوبر ۔ ۲۰۰۵

# HAIDER QURESHI KI AFSANA NIGARI KA MUTALA

A STUDY OF HAIDER QURESHI'S SHORT STORY WRITING

*Dessertation submitted to*

*the Jawaharlal Nehru Univesity In*

*fulfillment of the requirements for the award of the degree of*

MASTER OF PHILOSOPHY

by

**RAZEENA KHAN**

Under the supervision of

**Prof.MAZHAR MEHDI HUSSAIN**

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES

SCHOOL OF LANGUAGE,LITERATURE AND CULTURE STUDIES

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

NEW DELHI -110067

2014

# HAIDER QURESHI KI AFSANA NIGARI KA MUTALA

## A STUDY OF HAIDER QURESHI'S SHORT STORY WRITING

*Dissertation submitted to*
*the Jawaharlal Nehru University in*
*fulfillment of the requirements for the award of the degree of*

**MASTER OF PHILOSOPHY**


*Submitted By*

**RAZEENA KHAN**

*Supervisor*

**Prof. MAZHAR MEHDI HUSSAIN**


**Centre of Indian Languages**
**School of Language, Literature and Culture Studies**
**Jawaharlal Nehru University**
**New Delhi-110067**


**2014**